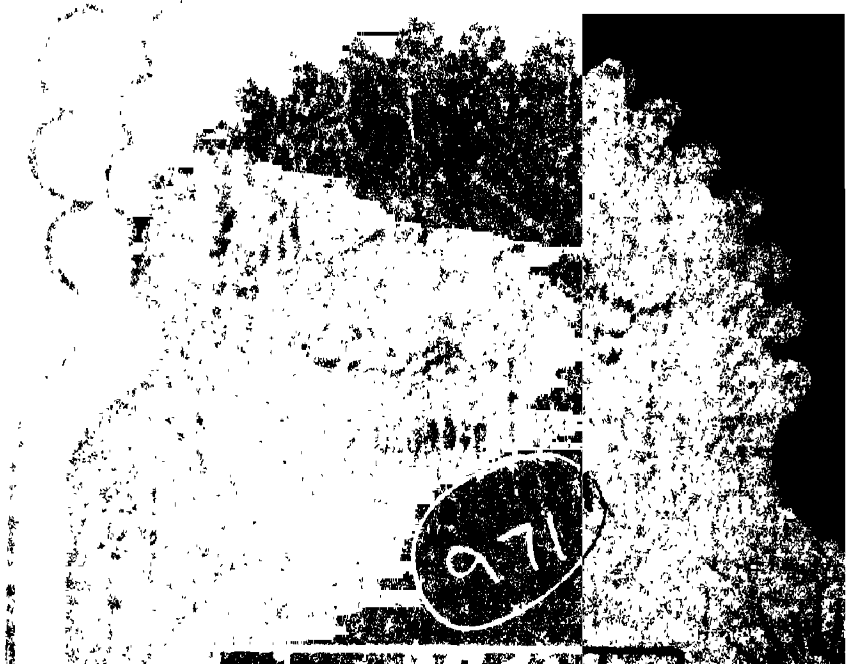
DUE DATE

Acc. No.

Late Fine Ordinary books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night book **Re. 1/-** per day.



۱۹۶۱

المصنف: محمد حسن ایم اے

اسسٹنٹ ایڈیٹر: شہنشاہ حسین (ایم اے)

اعزازی معاون: سید محمد تقی (ماسٹر)

College Staff.

Principal.

1. S. Maqsood Husain Naqvi, Esq. M.A., Dip. Ed. (Edin). Principal, (Logic and History.)
2. Mirza Ashiq Husain Esq., M.A., L.T., (English), President Literary Association, Principal's first Assistant

Teachers:—

3. S. Bandey Hasan, Esq., M.A., L.T., LL.B., (English and History)
4. Syed Akbar Ali, Esq., M.A., L.T., (Logic, Geog. and Maths) (On leave.)
5. S. Naqi Husain Alley, Esq., M.A., LL.B., A.T.C., (Economics, and Geography), Hostel Superintendent.
6. Syed Sarfaraz Husain, Esq., M.A., A.T.C., (History and Civics).
7. Naushah Husain Naqvi Esq., M.A., B.Sc., L.T., (Mathematics), Senior Games Superintendent
8. Manmohan Nath Zutshi, Esq., M.Sc., LL.B., L.T., (Physics and Mathematics), President Physics Association.
9. Bhola Nath, Esq., M.Sc., (Chemistry and Mathematics), President Chemistry Association.
10. Mohammad Ahsan Esq., M.A., (Eng.) M.A., pt. I. (Phil.) L.T., E.C.P.F., T. J. (English, Logic) Editor the "Archway".
11. Sambhu Dayal Verma, Esq., M.Sc., L.T., (General Secretary Nature Study and Hygiene), Incharge, First Aid and Red Cross Work.
12. Syed Sadiq Husain, Esq., B.A., M.F., (Arabic).
13. ,, Shahenshah Husain, Esq., M.A., (Persian and Urdu).
14. ,, Mohammad Mohsin Esq., M.A., LL.B., A.T.C., (Eng. and History).
15. ,, Asghar Husain, Esq., B.A., C.T., (English and Geography) Junior, Games Superintendent.
16. ,, Amir Husain Rizvi, Esq., M.A., L.T., (English and Geography.)
17. ,, Talmiz Husain, Esq., S.L.C., C.T., (Maths., Hindi and Hygiene).
18. ,, Ashraf Husain Esq., Inter., C.T., (Maths. and English).
19. ,, Manzoor Ali, Esq., Inter., A.T.C., (Maths., Persian an Urdu).
20. ,, Riza Haider Zaidi Esq., H. S. Dabir-i-Kamil, (Urdu).
21. M. Murtaza Husain Saheb, M.F., (Arabic, Urdu and Persian).
22. Wajid Mirza, Esq., (Drawing)
23. Wiqarul Islam Esq.,(drawing)
24. M. Ali Zamin Saheb, (Junior Theology Teacher and Hostel *Nazir-i-Diniyat*)
25. Ahmad Husain Saheb (Senior Theology Teacher.)
26. Syed Mohammad Raza Saheb, (Drill and Scouting).

Ministerial Staff.

1. Mr. Mirza Mohammad Zaki, B. Com., (Head Clerk).
2. Mr. Syed Mohammad Razi, H.S. (Librarian).
3. Mr. Syed Riza Ahmad Zaidi, H.S. (Assistant Clerk).

سہ ماہی میگزین
شیعہ انٹر کالج لکھنؤ



"ہمارے کالج کا نشان"

مرتبۂ پروفیسر ایم۔ ان زآتشی صاحب

ہتمام سید ریاض الحسن منیجر نظامی پریس لکھنؤ میں چھپا اور پروفیسر محمد حسن صاحب ایم اے، ایل ٹی ایڈیٹر نے شیعہ انٹر کالج لکھنؤ سے شائع کی۔

مندرجات

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	انقلاب	ادارہ	۱
۲	قطعات	جناب کمال عظیم آبادی	۴
۳	آفتاب تحقیق نصف صدی میں	سید حافظ علی صاحب رضوی صابر درجہ ہشتم	۵
	بحث و نظر		
۴	کلام غالب پر ایک نظر	رضا جمیل "سب ایڈیٹر"	۹
۵	حضرت اکبر الٰہ آبادی مرحوم	سید علی عباس صاحب درجہ دہم	۱۳
۶	امام المتغزلین	کامل صاحب عثمانی درجہ دوازدہم	۱۹
۷	مہجور پپیہا	احسن "ایڈیٹر"	۲۱
۸	اکبر اعظم اور مذہبی رجحانات	سید احمد صاحب زیدی درجہ دوازدہم	۲۴
	افسانہ		
۹	انتقام	مرزا محمود حسین صاحب درجہ یازدہم	۲۷
۱۰	شاہد	سید محمد غلام حسین صاحب رضوی درجہ دوازدہم	۳۱
۱۱	زندگی کی ایک رات	جناب سید محمد سبطین صاحب ایم اے فرسٹ	۳۷
۱۲	مجاز	علی عابد صاحب درجہ نہم	۴۲
	شعرستان		
۱۱	قصیدہ در مدح حضرت حجۃ عجل اللہ فرجہ	سید بہادر حسین صاحب دلکش فرسٹ ایر سائنس	۴۷

انقلاب

جب کبھی بھی کائنات کی ارتقاء سے بحث ہوتی ہے تو مانا جاتا ہے کہ ابتداء میں مادہ الکٹرون اور پروٹونوں کی شکل میں پوری فضا میں پھیلا ہوا تھا، قوت مدافعت اور قوت کشش ہر ذرہ کی برابر برابر تھی، اس لئے پوری فضا میں موت کا سا سکون پھیلا ہوا تھا، حرکت اور زندگی کا نام بھی نہ تھا۔ ایسی حالت ازل سے تھی، ابد تک رہتی لیکن "خدا کی باتیں خدا ہی جانے"، شاید اسکو سکون پسند نہیں۔ حکم ایزدی ہوا "کن فیکون"۔ اس وقت سے جو کائنات میں انقلاب ہوا تو کوئی گوشہ بچا نہیں۔ علامہ اقبال مرحوم کو بھی کہنا پڑا ہے:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

آج ہمارے رسالے کی دنیا میں بھی اسی انقلاب کا اثر ہوا، اس کے ہر گوشے میں ہر بات میں ایک تبدیلی ایک انقلاب ہو گیا۔ ایک نیا دور۔ اسی انقلاب کا نام زندگی ہے۔ ہر چیز جس جگہ ہے۔ جو ہے۔ اس سے بہتر جگہ اور برتر ہونا چاہتی ہے۔ اس رسالہ کی چھوٹی سی دنیا میں ہم کو یقین ہے۔ قدم قدم پر انقلاب ہونگے اور ہوتے رہنا چاہیئے

ہاں تو حکم ایزدی ہوا "فیکون"۔ مادہ ڈلوں میں جمع ہونے لگا۔ سحاب بنے ——— کچھ بچے ہیں —— ابھی اور انقلاب ——— سحاب سے تارے بنے ——— وہ بھی کچھ پسند نہ آئے ——— اس سے سیارے بنے ——— زمین بھی بنی ——— اسکی پسند۔ اسکی مرضی۔ وہ خالق۔ کسی کا کیا۔ کوئی کون؟ کہا "ہم یہاں خلیفہ مقرر کرینگے" ——— فرشتوں نے پر پھڑپھڑائے ——— زنجیروں کی جھنکار پیدا ہوئی ——— عرض کی "وہ جو زمین پر خلفشار پیدا کریگا" ——— ایک بار پھر ذرا دیر کے لئے موت کا ویسا ہی سکون چھا گیا۔

جواب ملا "نہیں جو ہم سمجھتے ہیں تم نہیں جانتے۔" ——— پھر سکون ——— ۔

مولانا ناصر الملۃ نے اس دنیا میں قدم رکھا ——— ۔

دنیا میں اک انقلاب کرنا چاہا ——— برس تک ان تھک کوششیں کیں ——— دنیا کے ہنگامے اسی طرح جاری ہے۔

دنیا آج بہت بڑی ہے۔

—— انقلاب ہوا —— ہندوستان کیا تمام عالم کے کلیجہ سے ہوک اٹھی۔ "مردہ باد انقلاب۔ مردہ باد" زندہ باد ناصرالملت۔—— آدنا صرالملت مردہ باد انقلاب —— سورج بھی جاکر مغرب کی گود میں سوگیا۔ اسکو بھی سکون کی ضرورت ہے —— دنیا میں اندھیرا چھا گیا —— آفتاب نے دنیا میں تھوڑی دیر کے لئے سکون کرنا چاہا —— مگر اس رات کو —— اس رات کو تو "انقلاب مردہ باد انقلاب" کے نعرے لگ رہے تھے فرشتوں نے پردوں میں منہ چھپا لیا۔ چپکے چپکے کہنے لگے "انقلاب ؟"

ہٹلر روس میں اپنے دھن کی طرح اپنی فوج جھونک رہا ہے۔ جاڑا شروع ہونے والا ہے۔ یہ خبر ہٹلر کے لئے موت کا پیغام ہے۔ تعجب نہیں جو زمین پر خلفشار پیدا کرنے والے روس کی برف میں ہمیشہ کیلئے ٹھنڈی نیند سوجائیں —— ہنگامے کے بعد سکون چاہیئے۔

جاپان چین کو کچلتا رہا —— مظلوم چین آزادی کی خاطر مرتا رہا —— ۵۰ برس ہوگئے —— چینی خدا کی طرف دیکھ رہے ہیں —— اُن کی زندگی میں انقلاب ہو رہا ہے —— لیکن خدا نے شیطان کو قیامت تک کی مہلت دے دی ہے —— اس کی مصلحت —— کوئی کیا سمجھے —— کسی کو کیا دخل —— ۔

دنیا اپنی آبادی کم کر رہی ہے۔ ماں کی گود میں بچے حلال ہو رہے ہیں۔ بھائی بھائی کا گلا گھونٹ رہا ہے روپیہ کو مشینوں میں تبدیل کرکے سمندروں میں ڈبویا جا رہا ہے۔ تاکہ اپنا بھائی مفلس ہوجائے۔ غلہ میں آگ لگائی جا رہی ہے۔ تاکہ بھائی فاقہ سے مرجائے —— اسپتالوں اور گھروں پر بم گرائے جا رہے ہیں۔ تاکہ بھائی بے گھر ہوجائے —— یہ سب کیوں ؟ کبتک —— انقلاب —— ابدتک۔

جگ بیتی !

"زبان"

آل انڈیا ریڈیو سے ۲۱ر فروری سے ۲۵ر فروری ۱۹۳۹ء میں جو چھ تقریریں ڈاکٹر تاراچند ڈاکٹر عبدالحق۔ راجیندر پرشاد۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اور آصف علی کی جو تقریریں ہوئیں ان میں اس مسئلہ پر اچھی طرح روشنی ڈالی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسان اردو کا نام "ہندوستانی" ہے اور یہی سارے دیس کی زبان ہے۔ اگر کوئی کہے "آسان ہندی" ؟ تو جواب ملتا ہے "آسان ہندی اردو ہی کا بچہ ہے لیکن "آسان" پر اعتراض ہوتا ہے۔ "آسان اور مشکل" دونوں لفظ اضافی ہیں۔ ایک لفظ جو آپ کے لئے آسان ہے میرے لئے مشکل ہوسکتا ہے

سو یہ سارہ تو ویسے کا ویسا ہی رہا۔ بات یہ ہے کہ لفظ جاندار ہوتے ہیں اور بہت نازک۔ ذرا مزاج بدلتے ہیں۔ عبارت میں نگینے ہوتے ہیں، اگر ذرا بدلو بس زیور کا خاتمہ۔ اچھے شاعر یا ادیب کی پہچان یہی ہے۔ جو لفظ جہاں ہے اسے ہٹاؤ تو مزا ہی کرکرا ہو جاتا ہے اس لئے اپنی زبان کا کوئی لفظ نکال پھینکنا اور اسی جگہ دوسری زبان کا لفظ توڑ مروڑ کر رکھنا جہالت ہے۔ اسکا مطلب یہ نہیں کہ بدیسی زبانوں سے لفظ نہ لئے جائیں۔ نہیں زندہ زبان میں برابر لفظ آتے رہتے ہیں۔ ان میں بقول ڈاکٹر عبدالحق "جو بندہ گیا وہ موتی۔ جو کھپ گیا وہ ہمارا اور جو نہیں کھپا سو غیروں کا"۔ یہی بات تراکیب کے ساتھ ہے چاہے وہ فارسی کی ہوں۔ عربی کی سنسکرت کی یا انگریزی کی۔ محاورہ کے ترجمہ لینا تھا بھی یہی بات ہے۔ انگریزی زبان کا محاورہ " .To throw light" کا اردو میں "روشنی ڈالنا" بہت حسین ترجمہ ہے اچھی ہوا اور سب کی زبان پر چڑھ گیا۔

"ہندوستانی" کا لفظ انگریزوں کی اپج ہے۔ کسی مستند شاعر یا ادیب نے استعمال نہیں کیا۔ انگریزوں نے اس زبان کو "ہندوستانی" کہا جو اس زمانہ میں شمالی ہندوستان میں بولی جاتی تھی سنہ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو اس لفظ کو دن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی۔

مسٹر آصف علی نے جو اپنی تقریر میں ایک تحریر کے تین نمونے پیش کئے وہ خوب سمجھا دیتے ہیں کہ ہندوستانی کیا ہے۔

بوجھل اردو:۔ شبِ تاریک میں رشکِ لماس ستارے ضیا پاشی کر رہے ہیں اشجار و اثمار، وحوش و طیور۔ تموج رود و بحر اب سکوت کے آغوش میں خوابیدہ ہیں بزمِ زیست کا طرب انگیز زمزمہ جو طلوع آفتاب کے بعد مثل اک سر بفلک کشیدہ فوارہ کے بادِ بہاری کے ناز و انداز کر رہا تھا ساکت و صامت ہے۔

بوجھل ہندی: گھنگھور راتری میں ہیرے کو بجت کرنے والے تارے جیوت کی ورشا کر رہے ہیں، برکت اور پھل، پکشی اور پشو اور دھارا ادن اور سمندر کی ترنگیں بھی ٹھہراؤ کی گود میں شانت کر رہی ہیں۔ جیون کی سبھا کا سنگیت جاگرت گان جو سوریہ کے اُدئے ہوئے پشچات آکاش سے باتیں کرتے۔ بھوارہ کے سمان وسنت وایو سے اچیلاہٹ کر رہا تھا اس سمے چپ اور استھر ہے۔

ہندوستانی:۔ رات اندھیری ہے اور ہیروں کو بجانے والے تارے جگمگا رہے ہیں۔ پیڑ پھل، چوپائے، پرندے، دریا اور سمندر کی لہریں سب خاموشی کی گود میں سو رہے ہیں۔ زندگی کی محفل کا دل گدگدانے والا گیت بھی جو کرن کے پڑنے سے ایک ایسے فوارہ کی طرح جو آسمان سے باتیں کرتا ہو بہار کی ہوا سے اٹکھیلیاں کر رہا تھا، اب ٹھہر گیا اور چپ ہے۔

ان تینوں زبانوں میں فرق اچھی طرح سمجھ میں آگیا ہوگا۔ آخری حصہ "ہندوستانی" اور "آسان اردو" کا فرق بھی معلوم ہوگیا ہوگا۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ زبان کو مذہب سے الجھا دیا ہے۔ ہندی کو ہندوؤں کی اردو کو مسلمانوں کی زبان مان لیا ہے، حالانکہ اردو "ہندو اور مسلمان" دونوں کی مشترکہ زبان۔ کسی ایک کی نہیں۔ ہاں یہ درست ہے کہ مسلمانوں نے اس کی زیادہ خدمت کی ہے۔ لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ ہندو اپنی اس مقدس بولی کو چھوڑ دیں "ادارہ"

قطعات !!

از نتیجۂ فکر جناب کمال عظیم آبادی (سابق ایڈیٹر "مجاہد")

خونِ جگر

آفتابِ علم، روحِ دیں، شریعت کا چراغ
جس سے روشن تھا زمانے میں ہدایت کا چراغ
چھپ گیا دنیا سے روئے حضرت ناصر حسین
بجھ گیا بادِ اجل سے بزمِ ملت کا چراغ

طوفانِ درد

رکنِ رکین مذہب و ملت نہیں رہا
روحِ روانِ بزمِ ہدایت نہیں رہا
دنیا میں آج شور بہ ہر سمت ہے کمال
ناصر حسین جانِ شریعت نہیں رہا

سوزِ دروں

ہم میں سے گئے کیا ناصر الملۃ علم کا ہر اسلوب گیا
اعمال کی اپنے تھی یہ خرابی جانے والا خوب گیا
دنیائے وفا کے گوشوں سے اک شور کمال اب کیوں نہ اٹھے
جس سے کہ زمانہ روشن تھا وہ دین کا سورج ڈوب گیا

آفتاب تحقیق مغرب میں

سرکار ناصر الملۃ کی زندگی کے مختصر حالات

از
سید حافظ علی رضوی صاحب برنڈیلوی
متعلم درجہ ہشتم

ہماری بدقسمتی کی انتہا ہوگئی کہ ایسے تاریک دور میں کہ جب دُنیا دہریت کی طرف تیزی سے جا رہی ہے، ہم اپنے رہنمائے اعظم خاتم الاجتہاد حضرت ناصر الملۃ سے چھوٹ گئے، یہ غم ایسا غم ہے کہ جو شیعوں کو تا بہ قیامت رہے گا وجہ یہ ہے کہ سرکار ناصر الملۃ کے بعد اب کوئی ہستی ایسی نہیں جو مذہب و ملت کی حمایت کا واحد مرکز ہو۔

یوں تو ہزاروں عالم اس دار فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے مگر ان کا رنج و غم کچھ عرصے کے بعد ختم ہوگیا، اسلیے کہ جب ایک عالم اُٹھتا تھا تو دوسرا قوم و مذہب کی حمایت کرتا تھا، مگر خاتم الاجتہاد حضرت ناصر الملۃ کے بعد جسم اجتہاد و علم و ادب بے روح ہوگیا، اور نہ صرف دُنیائے شیعیت بلکہ تمام عالم اسلامی کا آفتاب علم و ادب غروب ہوگیا، حضرت ناصر الملۃ کی ذات وہ ذات تھی کہ اپنے تو اپنے دشمن اور جانی دشمن آپکے علم و کمالات کے معترف تھے، اگر سرکار مرحوم کی ثنا و صفت بیان کی جائے تو کافی لیاقت کی ضرورت ہے اس لیے کہ علماء کی قدر علما ہی کرسکتے ہیں، اور پھر عالم بھی ایسا کہ جس کو روحانیات تک پر قدرت حاصل ہو، لہذا مجھ ایسا جاہل اس عالم علوم ربانی کی شان میں کیا قلم اُٹھا سکتا ہے، لیکن صرف اتنا کہ سرکار مغفور کی زندگی کے مختصر حالات جو میرے ذاتی علم میں ہیں ان کو اپنے ہمعصر طلبا کے سامنے پیش کردوں تاکہ وہ سرکار مغفور کی پاکیزہ زندگی سے اثر لے کر کچھ استفادہ حاصل کرسکیں۔

ولادت باسعادت آپ کی ولادت بروز پنجشنبہ ۱۹ رجمادی الثانیہ ۱۲۸۴ھ کو ہوئی، اور آپکا روز انتقال پنجشنبہ، یکم رجب ۱۳۶۱ھ ہے۔

اسم گرامی آپکے والد محترم علامہ سید حامد حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ نے ناصر حسین رکھا، درحقیقت آپ ناصر حسینؑ ہی تھے، آپنے اپنی زندگی کے ہر شعبہ سے نصرت حسینؑ کی، یہاں تک کہ جان بحق تسلیم ہوگئے، آپکے عم نامدار نے آپکا اسم مبارک اسحاق رکھا تھا۔

خاندانی شرافت آپ کا نسب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے منسلک ہوتا ہے، آپکے جد امجد علامہ سید محمد قلی خاں اعلی اللہ مقامہ اور آپکے والد علامہ سید حامد حسین صاحب اعلی اللہ مقامہ مصنف

عبقات الانوار تھے، اس کے علاوہ آپ کے خاندان میں کئی جلیل القدر ہستیاں گذری ہیں۔

تعلیم و تربیت

جب آپ کا سن شریف ۴ سال کا ہوا تو یکم رمضان ۱۲۸۸ھ کو تعلیم کی ابتدا ہوئی اور آپ ابتدائی دینیات جناب مولوی لطف حسین صاحب بلوی کے متعلق ہوئے۔ اس کے بعد خود فردوس مآب نے اپنے ہاتھوں تعلیم و تربیت دینا شروع کی، ظاہر ہے کہ آپ کی تعلیم کس درجہ انہماک کیا گیا ہوگا کہ آپ صرف سولہ برس کے سن میں فارغ التحصیل ہو چکے تھے اور درجہ اجتہاد پر فائز ہو چکے تھے۔ آپ کے اساتذہ میں صرف مولوی لطف حسین صاحب اور علامہ محمد عباس صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ اور خود جناب فردوس مآب تھے، ان حضرات کے علاوہ آپ نے اور کسی کے سامنے زانوے ادب تہ نہیں کیا۔ آپ کے علاوہ کوئی عالم میری نظر میں ایسا نہیں ہے کہ جس نے اتنی کم عمر میں یہ مدارج علمیہ طے کر لئے ہوں۔

کتب خانہ

آپ کا ایک کتب خانہ بمقام کھجوا لکھنؤ میں ہے جو اپنی نوعیت سے ہندوستان کیا بلکہ تمام عالم اسلامی میں ایک ہے، جس کی اہمیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ ۱۹۱۲ء میں کیمبرج میں مستشرق یورپ سے آیا اور کئی دن تک معائنہ کرنے کے بعد ایک بیان اخبارات میں شایع کیا اور عالم مستشرق نے کہا کہ میں نے پچیس ہزار کتابوں کے حاشیوں پر سرکار ناصر الملۃ کے نوٹ دیکھے جو ان کی قابلیت کی گواہی دے رہے ہیں۔ مولانا رشید رضا، یڈیٹر الھلال مصر جب ہندوستان تشریف لائے تو مولانا نے اب ملاحظہ کہا کہ میرا ہندوستان آنے کا کوئی مقصد پورا نہ ہوتا اگر میں بغیر اس کتب خانہ کی زیارت کئے چلا جاتا حالانکہ جامع ازہر مصر کی تمام کتابیں میرے پیش نظر ہیں لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ بہت سے قلمی نسخے کتب خانۂ ناصریہ میں ایسے موجود ہیں جو وہاں بھی نہیں ہیں۔ اس کتب خانہ کے علاوہ آپ نے مزار شہید ثالث میں بھی ایک کتب خانہ قائم فرمایا تھا اور آپ ہی کی ذات وہ ذات تھی جس نے حضرت نور اللہ شوستری کے کارناموں کو روشن کیا۔

خطابات

صدر المحققین۔ چونکہ آپ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہی جناب فردوس مآب کا ہاتھ عبقات کی تصنیف میں بٹانے لگے تھے اس لئے جناب فردوس مآب نے اپنے فرزند سے خوش ہو کر آپ کو صدر المحققین کے خطاب سے ملقب فرمایا۔

ناصر الملۃ۔ یہ خطاب آپ کو علامہ مرزا شیرازی نے عطا فرمایا تھا۔ علامہ شیرازی اتنے بڑے جید عالم گذرے ہیں کہ جن کے آگے اکثر شہنشاہ ایران کو بھی سرنگوں ہونا پڑتا تھا۔

شمس العلماء۔ حکومت ہند نے آپکے رعب و جلال اور وقار علمی کو مدنظر رکھتے ہوئے شمس العلماء کا خطاب پیش کیا تھا لیکن سرکار مرحوم نے جو مظالم بارہ وفات کے سلسلہ میں شیعوں پر ہوئے ان سے احتجاج کرتے ہوئے خطاب واپس فرما دیا تھا۔

ذوقِ شعر و سخن

آپ کو شعر و سخن کا بھی از حد شوق تھا اور اگر یہ کہا جائے کہ ناصر الملۃ کی وہ ذات ہے جس نے ہزاروں شاعر بنا دیئے تو غلط نہیں ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں آپ کے شریعتکدہ پر ہر معصوم کی ولادت اور شہادت کی تاریخ پر محفل یا مجلس منعقد ہوا کرتی ہے جس میں شعرائے کرام اپنا کلام سنا کر سامعین کو محظوظ کرتے اور داد سخن پاتے ہیں۔ ان محفلوں کا سلسلہ اکثر کئی کئی دن تک جاری رہتا چنانچہ آپ کو یہ قصیدہ خوانی اسقدر پسند تھی کہ آپ ایسے موقعوں پر کہیں جانے سے پرہیز کرتے تھے، ایک مرتبہ کا مشہور واقعہ ہے کہ دلی دربار کے موقع پر سرکار ناصر الملۃ کو کنگ جارج کے پرائیوٹ سکریٹری کا تار دربار میں شرکت کے لئے موصول ہوا۔ چونکہ جس روز دربار ہونے والا تھا عین اسی دن کسی معصوم کی ولادت کی تاریخ تھی اور آپ کے شریعتکدہ پر محفلِ قصیدہ خوانی منعقد ہونیوالی تھی آپ نے دربار کی شرکت سے انکار کر دیا۔

نصرتِ حسینؑ

سرکار مرحوم عزاداری امام مظلوم میں خاصی دلچسپی رکھتے تھے، اگر ملک یا شہر میں کوئی عزائے حسین کی مخالفت میں تحریک ہوتی تو سرکار مرحوم اس تحریک کی سختی سے مخالفت فرماتے تھے، اس کے علاوہ آپ ہی کی ذات وہ ذات تھی جس نے مبلغین اور واعظین کو وہ راہیں بتلائیں جو صحیح تھیں۔ ذاکرین اکثر غلط اور غیر صحیح روایتیں پڑھ دیا کرتے تھے لیکن آپ نے اپنی تحقیقات سے ان غلط روایتوں کو بند کرا دیا۔ بہرحال عزائے حسین کی آپ نے اتنی نصرت کی کہ آخر وقت تک حسینؑ کا کلمہ پڑھتے رہے اور اپنے وصیت نامہ میں یہ بھی لکھ گئے کہ میری مجالس میں حسینؑ کا ذکر زیادہ کرنا اور انکے ذکر کے آگے میرا تذکرہ نہ ہونے پائے۔

سیاست

سرکار مرحوم جب شیعہ قوم کسی مصیبت میں گرفتار ہوتی تو اس کی کس طرح رہنمائی فرماتے تھے، یہ گذشتہ ایجی ٹیشن سے ظاہر ہے، سرکار مغفور ہمیشہ سیاست حسینیہ پر گامزن رہتے اور ہمیشہ مذہب و ملت کی حمایت فرماتے رہتے، اس سے زیادہ آپ کی سیاست اور دماغ کی تعریف کرنا بیکار ہے اس لئے کہ آپ کی ذات شیعہ قوم کے لئے مشعل کی روشنی تھی۔

ناصر الملۃ علماء اسلام کی نظر میں

درحقیقت آپ کی ذات اقدس کو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ آپ علماء اسلام کی نظر میں جو وقعت رکھتے تھے اسکو اگر تفصیل سے لکھا جائے تو یہی ایک طویل مضمون ہو سکتا ہے لیکن اسوقت میری نظر میں اسلام کے دو چند علماء کے خطوط موجود ہیں، جن کے بعض اقتباسات اجمالاً تحریر کرتا ہوں، اسکے علاوہ اور علماء کے خطوط کتب خانہ ناصریہ میں موجود ہیں، علامہ نوری اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ مجھکو معلوم ہوا ہے کہ جناب اپنی جسم و جان کا کچھ خیال نہیں فرماتے جو کہ آپکے پاس امانتِ خدا ہیں آپکے اس درجہ تقلیل غذا کی خبریں کچھ اچھی نہیں سن رہا ہوں، اس کے علاوہ علامہ نوری اپنے ایک اور خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ آپ دین خدا کی حمایت کر رہے ہیں لہٰذا اس میں صحت کی سخت ضرورت ہے۔

جناب حجۃ الاسلام آقا سید اسمٰعیل صدر ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ کاش کہ یہ حقیر آپ کے پاس ہوتا اور جناب کے علمی و عملی فیوض سے مواعظ و نصائح، فضائل و مناقب سے مستفیض ہوتا۔

اخلاق

سرکار مغفور کے اخلاق کو کون بیان کر سکتا ہے کہ آپ کن صفات حمیدہ کے مالک تھے، صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ آپ نے اپنے اخلاق سے یہ ثابت کر دیا کہ ائمہ طاہرین کے اخلاق کیسے تھے۔ آپ کے اخلاق کی بعض مثالیں تو ایسی ملتی ہیں کہ جو دنیا میں کہیں نظر نہیں آتیں، اکثر میں نے خود دیکھا ہے کہ سرکار مرحوم باوجود انتہائی ضعف و نقاہت کے رمضان مبارک میں تین تین جگہ نماز ظہرین پڑھاتے تھے، اگر کوئی غریب آدمی آپ کو مدعو کرتا تو فوراً اس کو شرف تشریف آوری بخشتے۔

خودداری

سرکار مرحوم کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ اگر آپ سے کوئی غرور و تمکنت سے ملتا تو آپ بھی اس سے ملنا پسند نہ فرماتے تھے۔ سرکار مرحوم عام طریقہ سے رؤسا سے ملنا پسند نہ فرماتے تھے، لیکن اگر کوئی غریب آگیا تو خود تشریف لاتے اور اس کی تشفی فرماتے۔

غذا

سرکار مرحوم کی غذا نہایت سادہ ہوتی تھی، آپ صرف ایک وقت خاصہ نوش فرماتے تھے لیکن اسمیں بھی ایک روٹی جسمیں برابر کی بھوسی ہوتی تھی، آپ اکثر سالن میں پانی ملا لیا کرتے تھے تاکہ اسکا ذائقہ مٹ جائے

لباس

آپ نہایت صاف و ستھرے کپڑے پہنتے تھے لیکن ان کی قیمت نہایت معمولی ہوتی تھی۔

اولادیں

آپ کے فرزند اکبر حضرت نصیر الملۃ مولانا سید محمد نصیر صاحب قبلہ مجتہد پرنسپل شیعہ عربی کالج ہیں جن کی قابلیت کا اعتراف اغیار کو بھی ہے۔ فرزند اصغر سرکار سعید الملۃ مولانا سید محمد سعید صاحب قبلہ مجتہد العصر۔ آپ سرکار ناصر الملۃ کی عبقات الانوار کی تصنیف فرما رہے ہیں

کلامِ غالب پر ایک نظر

رضا جمیل
"سب ایڈیٹر"

جدید اور حسین تراکیب کی تخلیق

اگر غالب نہ پیدا ہوتا تو اردو شاعری دراصل گل و بلبل کا افسانہ اور زلف و کمر کی داستان ہو کر رہ جاتی غالب سے پہلے تمام شعرا کی کائنات یہ تھی کہ مبالغوں سے اپنے کلام کو مجموعۂ محالات بنا لیا، محبوب کی توصیف پر اُترے تو دہن اور کمر ہی غائب کر دی، شبِ ہجر کی درازی بیان کرنے پر آئے تو اس کا دامن دامانِ قیامت سے جا باندھا۔ اپنی لاغری کا ذکر آگیا تو گمان یہ ہوا کہ چادر پر شکن پڑ گئی ہے، کہنے لگے مرنے کے بعد بولنا، قتل ہو کر قاتل کی گردن پر سوار ہونا، اس وقت جب حسرت و نومیدی کے اشعار نے دلوں کو بجھا دیا تھا طبیعتیں افسردہ ہو چلی تھیں، غالب نے اس کے خلاف آوازِ بلند کی اور پکار کر کہا ؎

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ — اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

اردو شعرا معشوق کی کمر کو تلاش کر رہے تھے لیکن غالب نے۔

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق — لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

کی بلندی سے آواز دے کر فضا میں ایک گونج پیدا کر دی۔

قدیم شعرا کے بڑے حصہ کا خصوصاً لکھنؤ کی ناسخ و امانت شاہی شاعری کا دار و مدار زیادہ تر لفاظی پر رہا ہے ان کی غزل کا معشوق ہاتھ پاؤں میں مہندی لگائے اور خوب گہرے دھانی رنگ کا جوڑا پہنے بیٹھا تھا، عاشق کی نگاہیں ڈر کے مارے چلمن کو چھو بھی نہیں سکتی تھیں لیکن غالب کی جراتِ بے باک آگے بڑھی یہاں تک کہ۔

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن — غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

اٹھارہویں صدی کے متغزلین کا عاشق اپنے جنون کے سبب سے اس قدر دبلا ہو گیا تھا کہ مثل ملک کے معلوم ہوتا تھا، رات دن آہ و فریاد کرتا لیکن رحم تو درکنار معشوق کو یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ تڑپنے والا کیوں اور کس کے لئے تڑپ رہا ہے لیکن غالب کا عاشق ایک چینِ جبیں سے ساری داستان سنا دیتا ہے ؎

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا — رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

چوٹ لگتی ہے تو آہ نکل ہی جاتی ہے، غالب بھی فریاد کرتا ہے مگر اس شان سے ؎

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ — اے نالہ! نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

اب آیئے یہ دیکھیں کہ غالب کو امتیازی درجہ کیوں حاصل ہے؟

غالب اُردو کا وہ پہلا شاعر ہے جس نے اردو شاعری میں بالکل جدید اور حسین تراکیب استعمال کیں۔ غالب کی ترکیبیں اور بندشیں آج اردو ادب کے لئے سرمایۂ افتخار بنی ہوئی ہیں جو بیش بہا موتیوں سے کم نہیں۔ ترکیبیں ایسی کہ زبان اُنسے بہت جلد مانوس ہوگئی، جس کے احسان سے اردو ادب کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

غالب کو الفاظ برتنے کا خاص سلیقہ ہے، اُن کی حسین ترکیبیں اور بندشیں عام پرواز فکر کی سطح سے بلند ہیں۔ تخئیل کی پاکیزگی، مذاق کی ستھرائی، بیان کی سنجیدگی، زبان کی صفائی، جذبات کی بلندی، واردات عشق کی مصوری، بندش کی پائداری اور اسلوب بیان کی جدت نے غالب کو سب سے نمایاں اور ممتاز بنا دیا ہے اور بعض باتوں میں تو اردو کا کوئی شاعر غالب کا بمقابل ہی نظر نہیں آتا، ان کے استعمال کئے ہوئے الفاظ اشعار میں اگر نغمہ تمام "بنجاتے ہیں کہ گنگنائیے اور وجد کیجئے۔ کون نہیں جانتا کہ شعر کا مقصد روح کو عملی دنیا کی کشمکش سے نکال کر راحت اور مسرت سے لبریز کر دینا ہے، جذبات میں لطافت پیدا کرنا، احساسات کو بیدار کرنا، کردار میں حسن پیدا کرنا، ارادہ کو استحکام اور استقلال بخشنا، ہمدردی، اخوت، محبت، اور یگانگت پیدا کرنا، یہ سب چیزیں شعر کی خصوصیات میں داخل ہیں اور شعر و ادب میں الفاظ ہی کا تو سارا کھیل ہوتا ہے۔ یہ تمام باتیں ہر شاعر نے بنا ہیں لیکن غالب کے وجدان پر قدرت نے استعمال الفاظ کے تمام راز کھول دیے تھے اور ان کو خاص قدرت حاصل تھی، غالب ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے اردو ادب میں سب سے پہلے ایجاد تراکیب کی بنیاد ڈالی اور وہی اسکا موجب ہے اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج جو کچھ اس کے سلسلہ میں ہو رہا ہے اسکا رہبر اول غالب ہی ہے۔

میرے خیال میں جدید تراکیب اور حسین بندشیں بنانے کا مسئلہ بہت ہی نازک ہے۔ ہر شخص اسکا خلاق اور اہل نہیں ہو سکتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ غالب کی دیکھا دیکھی بعض لوگوں نے (جو الفاظ کے استعمال و مصرف سے ناواقف ہیں) تقلید کرنا چاہی اور اُسی روش پر چلنا چاہا، لیکن ان میں اور غالب میں وہی فرق رہا جو اصل اور نقل میں ہوا کرتا ہے۔

جدید تراکیب کو انتہائی رواں اور شستہ ہونا چاہیئے تاکہ زبان اُن سے جلد مانوس ہو جائے۔ غالب کی بنائی ہوئی تراکیب میں زبان و ادب کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں اسی لئے غالب کی ایجاد کردہ تراکیب بہت جلد زبان میں گھل مل گئیں۔

غالب کے کلام میں قدم قدم پر نئی تراکیب اور حسین بندشیں نظر آتی ہیں جنکا بہت زیادہ حصہ نایاب اور لطیف ہے ان تراکیب سے تحسین کلام کے علاوہ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ایک بڑا خیال چند لفظوں میں ادا ہو جاتا ہے۔ بخوف طوالت صرف چند مثالوں پر اکتفا کیجاتی ہے۔

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے ؛ مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

"دامِ شنیدن" کتنا لطیف اور بیش بہا موتی شعر میں پرو دیا ہے۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ؛ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

"زود پشیماں" بالکل جدید ترکیب اور معنویت میں تو حافظ کے شعر ؎

آفریں بر دلِ نرمِ تو کہ از بہرِ ثواب ؛ کشتۂ غمزۂ خود را، بہ نماز آمدہٗ

سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ؛ درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

عشرتِ قطرہ کس قدر فلسفہ اور تصوف سے بھری ہوئی ترکیب ہے۔

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے ؛ خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

"نشاط آہنگ" کی موسیقیت پر غور کیجئے اور پڑھ کر وجد کیجئے یہی نہیں بلکہ اس بحر کی پوری غزل شروع سے آخر تک جدید تراکیب کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے اور اپنی جگہ پر ہر شعر بہت خوب اور خوب ہے۔

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا ؛ ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

"شرمندۂ معنی" کی ترکیب نے شعر کی بلندی اور معنویت کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے، جہاں تک زبان کا لطف ہے یہ شعر بھی اسی قابل ہے کہ انسان جھوم جھوم کر پڑھے اور پھر بار بار پڑھے، اور دنیا پر ثابت کر دے کہ وفا شناس یا شعر کہنے والا تھا یا پڑھنے والا ہے۔"

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی ؛ مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

پورے کا پورا شعر ترکیبِ جدید کا آئینہ دار ہے بلکہ بعض باتوں میں تو غالب کا یہ شعر میر درد کے مشہور شعر ؎

خلوتِ دل نے کر دیا اپنے حواس میں خلل ؛ حسن بلائے چشم ہے، نغمہ وبالِ گوش ہے

سے بھی بڑھ گیا ہے۔

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ ؛ یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

"جنتِ نگاہ" اور "فردوسِ گوش" جیسی نادر اور جدید تراکیب اردو ادب کے لئے غیر فانی سرمایہ ہیں جس پر سکو آج بھی ناز ہے۔

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم ؛ برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

وضعِ احتیاط کی ترکیب داد سے مستغنی ہے، اس شعر کو پڑھنے کے بعد واقعہ کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

عشق بے ربطیٔ شیرازۂ اجزائے حواس ؛ وصل زنگارِ رخِ آئینۂ حسنِ یقیں

عشق اور وصل کی تصویر ملاحظہ کیجئے اور داد دیجئے، یہی نہیں بلکہ پوری منقبت حضرت علیؑ جو منقبت شیرِ خدا کے نام سے چھپی ہے بیش بہا اور نادر تراکیب کی آئینہ دار ہے۔

اب اگر آپ کو زبان کی صفائی اور خالص اُردو زبان کی لطافت دیکھنا ہو اور لطف حاصل کرنا ہو تو غالب کی مشہور غزل "دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے" اور دوسری مشہور غزل "سینہ جویائے زخم کاری ہے" پڑھکر لطف اندوز ہوجیئے اور حسین بندشوں کی داد دیجئے۔

آخر میں ایک بار پھر میں عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اردو شاعری میں غالب ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے مبالغہ سے ہٹ کر ایجاد تراکیب کی بنیاد ڈال کر اردو شاعری کو اُردو شاعری بنا دیا اور یہی وجہ ہے کہ غالب کی حیثیت ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

اقوالِ زرّیں

(۱) عورت ایک گلاب کا پھول ہے اور اس میں خودداری کا ایک چھوٹا سا کانٹا لگا ہوا ہے۔ (ٹینی سن)

(۲) موت کو آسان رکھو، کیونکہ موت کی تلخی صرف اس کے خوف سے پیدا ہوتی ہے (ارسطو)

(۳) انسانی ذہن اپنا مقام ہے وہ بہشت کو دوزخ اور دوزخ کو بہشت بنا سکتا ہے۔ (ملٹن)

(۴) موت سے بچنا محال ہے، موت بادشاہوں کو بھی نہیں چھوڑتی (شرلے)

(۵) سنگین دیواریں اور آہنی سلاخیں قید خانہ نہیں بنا سکتیں (لویس)

حضرتِ اکبر الٰہ آبادی مرحوم

سید علی عباس
درجہ دہم

یہ سیارہ دنیا والوں کو ۱۸۴۶ء کی ۱۶ر نومبر کو دکھائی دیا۔ الٰہ آباد میں چمکا، ہندوستان بھر میں دھوم مچی۔ ۹ر ستمبر ۱۹۲۱ء میں غائب ہوگیا۔

لسان العصر خان بہادر سید اکبر حسین اکبر کے مورثِ اعلیٰ سید علی عرب نیشاپور سے ۱۶۳۲ھ میں ہندوستان میں تشریف لائے۔ سید صاحب کے والد سید تفضل حسین عرف چھوٹے میاں نائب تحصیلدار تھے۔

ابتدائی کتابیں اکبر نے گھر ہی میں پڑھیں اس کے بعد جمنا مشن اسکول الٰہ آباد میں داخل ہوگئے، ۲ سال تک وہیں تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کا سلسلہ یہاں ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد جو کچھ پڑھا وہ خود سے۔ کسی وجہ سے جمنا برج کی تعمیر کے سلسلہ میں نوکری کرلی، اسکے بعد ہی ریلوے ڈیپارٹمنٹ کے مال گودام میں نوکری مل گئی، طبیعت نہیں لگی کچہری میں نقل نویس ہوگئے۔ بہت زمانہ نہیں گذرا تھا کہ تحصیلدار ہوگئے۔ اسکو بھی چھوڑا، ہائی کورٹ میں مثل خواں ہوگئے وکیلوں کی صحبت رہی جو وہ بھی وکالت کا امتحان پاس کرلیا۔ الٰہ آباد میں وکالت شروع کی مگر ایک جگہ قیام نہیں کیا، کبھی گونڈے میں ہوئے، کبھی آگرہ اور کبھی گورکھپور میں۔ ۱۸۸۰ء میں منصفی کے امتحان میں بیٹھے۔ پاس کرلیا، نامزد ہوگئے۔ ذہین اور ہوشیار تھے ہی ترقی کرتے رہے یہانتک کہ ڈسٹرکٹ سشن جج ہوگئے۔ سہارنپور۔ مین پوری، بنارس اور الٰہ آباد میں تبادلہ ہوتا رہا ۱۸۹۰ء میں خان بہادر کا خطاب ملا۔ ۵ برس بعد ریٹائرڈ ہوگئے۔ ۹ر محرم ۱۳۴۰ء کو جمعہ کے دن انتقال ہوگیا۔ آخری وقت خواجہ حسن نظامی بھی موجود تھے۔ تین بجنے میں ۳ منٹ باقی تھے کہ انتقال ہوا۔ کالے ڈانڈے کے قبرستان میں اپنے والد کے بائیں طرف دفن ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ جب قبر میں اتارا گیا تو آنکھیں کھلی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کسی کو غور سے دیکھ رہے ہیں۔

اکبر کے آخری دو اشعار یہ ہیں:۔

صاحب میں سب برائی لیکن وہ خوب جوکس ۔۔۔ گاندھی میں سب بھلائی لیکن محض وہ بے بس
دنیا تو چاہتی ہے ہنگامۂ پُر وجن ۔۔۔ اور یاں ہے جیب خالی جو مل گیا وہ بھوجن

اکبر گندمی رنگ کے دُبلے پتلے آدمی تھے، میانہ قد تھا، سادی پوشاک پہنتے تھے، آنکھوں کی بصیرت کم ہوگئی تھی بہت ظریف آدمی تھے۔ مزاج میں بہت انکسار تھا، ہر ایک سے خوش ہو کر ملتے تھے۔

شاعری کی ابتدا تو جب ۱۱ برس کے تھے تب ہی سے شروع ہوگئی تھی۔ مولوی وحیدالدین صاحب نجوبی

سے اصلاح لیتے تھے۔ اصل میں اکبر کا شروع کا کلام سجاد حسین صاحب نے چھپایا جب وہ اودھ پنچ کے اڈیٹر تھے۔ اسی سلسلہ میں اکبر نے نثر میں بھی مضامین لکھے۔

غدر کے بعد مسلمانوں کی حالت بالکل تباہ ہوگئی تھی اس لئے سر سید نے انگریزوں سے اشتراک عمل کیا اور اس طرح از سر نو قوم کی تعمیر کی۔ اکبر خوب سمجھتے تھے کہ اس طرح مغربی رنگ کسطرح مشرق پر چڑھ جائے گا۔ اس لئے وہ اس کو روکنا چاہتے تھے، مگر اتنی طاقت کہاں تھی، صرف یہی سبب ہے جس سے کلام میں یہ طرز اختیار کیا۔ غور سے پڑھنے پر کلام کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ کالے منہ پر ہلکا سفید پردہ پڑا ہے۔ چھیڑنے پر اصل کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی ہنسی خون کے آنسو رلاتی ہے۔

اکبر غزل بھی کہتے تھے جس میں تصوف کا رنگ ہوا کرتا تھا۔ یہاں ان کی تین نظمیں اور کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ چناؤ میں خیال رکھا گیا ہے کہ انکا رنگ جھلکتا رہے:۔

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر — مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہدِ مقصود کے ہیں — نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس
سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ — کیا ہے جس کو میں نے زیبِ قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلےٰ کی ماں نے — کہ بیٹا! تو اگر کرلے ایم اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے — بلا دقت میں بنجاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی — کجا عاشق، کجا کالج کی بکواس
کجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت — کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس
بڑی بی آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ — ہرن پہ لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی — مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس
دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود — نہیں منظور مغزِ سر کا آماس
یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلےٰ — تو استعفا مرا باحسرت و یاس

اک مسِ سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد — اس خطا پر سُن رہا ہوں طعنہ ہائے دل خراش
کوئی کہتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسلِ قوم — کوئی کہتا ہے کہ یہ ہے بدخصائل و بدمعاش
دل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ — ہو کے اب مجبور خود اس راز کو کرتا ہوں فاش
ہوتی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو — قومِ انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع و تراش

جگمگاتے ہوٹلوں کا جا کے نظارہ کرو
سوپ و کاری کے مزے لو چھوڑ کر یخنی و آش

لیڈیوں سے مل کے دیکھو اُن کے انداز و طریق
ہال میں ناچو، کلب میں جا کے کھیلو اُن سے تاش

بادۂ تہذیبِ یورپ کے چڑھاؤ خُم کے خُم
ایشیا کے شیشۂ تقوے کو کر دو پاش پاش

جب عمل اس پر کیا پریوں کا سایہ ہو گیا
جس سے تھا دل کی حرارت کو سراسر انتعاش

اُس کی چتون سحر آگیں اس کی باتیں دلربا
چال اُس کی فتنہ خیز اس کی نگاہیں برق پاش

جب یہ صورت تھی تو ممکن تھا کہ اِک برقِ بلا
دستِ سیمیں کو بڑھاتی اور میں کہتا دور باش

دونوں جانب تھا رگوں میں جوشِ خونِ فتنہ زا
دل ہی تھا آخر نہیں تھی برف کی یہ کوئی قاش

بار بار آتا ہے اکبر دل میں میرے یہ خیال
حضرتِ سید سے جا کر عرض کرتا کوئی کاش

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ٔ
باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

رات اُس مس سے کلیسا میں ہوا میں دوچار
ہائے وہ حُسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ اُبھار

زلفِ پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید
قدِ رعنا میں وہ خم خم کہ قیامت بھی شہید

آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں
گال وہ صبحِ درخشاں کہ ملک پیار کریں

گرم تقریر جسے سننے کو شعلہ لپکے
دلکش آواز کہ سُن کر جسے بلبل چہکے

دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے رُک جائیں
سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں

آتشِ حسن سے تقویٰ کو جلانے والی
بجلیاں لطفِ تبسم سے گرانے والی

پہلوئے حُسنِ بیاں شوخیٔ تقریر میں غرق
ترکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق

پس گیا ٹوٹ گیا، دل میں سکت ہی نہ رہی
سُر تھے تمکین کے جس گت میں وہ گت ہی نہ رہی

ضبط کے عزم کا اسوقت اثر کچھ نہ ہوا
"یا حفیظ" کا کیا ورد مگر کچھ نہ ہوا

عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار
دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار

تو اگر عہدِ وفا باندھ کے میری ہو جائے
ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے

شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی
ناز و انداز سے تیوری کو چڑھا کر بولی؛

غیر ممکن ہے مجھے اُنس مسلمانوں سے
بوئے خون آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بنکر
حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بنکر

کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں   آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں
مطمئن ہو کوئی کیونکر کہ ہیں یہ نیک نہاد   ہے ہنوز انکی رگوں میں اثرِ حکمِ جہاد
دشمنِ صبر کی آنکھوں نے لگاوٹ پائی   کامیابی کی دلِ زار نے آہٹ پائی
عرض کی میں نے کہ اے لذتِ جاں حیف ہے یہ   اب زمانے پہ نہیں ہے اثرِ آدم و نوح
شجرِ طور کا اِس باغ میں پودا ہی نہیں   گیسوے حور کلاس دَور میں سودا ہی نہیں
اب کہاں ذہن میں باقی ہیں براق و رفرف   ٹکٹکی بندھ گئی ہے قوم کی انجن کی طرف
یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوشِ سپاہ   سب کے سب آپ ہی پڑھ لیتے ہیں سبحان اللہ
جوہرِ تیغِ مجاہد ترے ابرو پہ نثار   نورِ ایماں کا ترے آئینۂ رو پہ نثار
اٹھ گئی صفحۂ خاطر سے وہ بحثِ بد و نیک   دو دِلے ہو رہے ہیں کہتے ہیں اللہ کو ایک
موجِ کوثر کی کہاں اب ہے مرے باغ کے گرد   میں تو تہذیب میں ہوں پیرِ مغاں کا شاگرد
مجھ پہ کچھ وجہِ عتاب آپ کو ایجاں نہیں   نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں
مرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو   ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھکو بھی راضی سمجھو

عشرتی گھر کی محبت کا مزا بھول گئے   کھا کے لندن کی ہوا عہد وفا بھول گئے
پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی   کیک کو چکھ کے سویوں کا مزا بھول گئے
موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی   چمنِ ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں   اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا   کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی   تو کام دیں گی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک
جو رونمائی کی رسموں پہ ہے مصر ابلیس   چھپیں گی حضرت حوا کی بیٹیاں کب تک

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے   کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمّن
گرجا میں تو کرنیل و کمشنر بھی ہیں موجود   مسجد میں کوئی ڈپٹی و منصف بھی نہیں ہے

ریزولیوشن کی شورش ہے مگر اسکا اثر غائب
پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہیں مگر آرام کے ساتھ

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں، مرے اسپتال جاکر

بتاؤں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

مے بھی ہوٹل میں پیو چندہ بھی دو مسجد میں
شیخ بھی خوش رہیں شیطان بھی بیزار نہ ہو

عیش کا بھی ذوق دینداری کی شہرت کا بھی شوق
اب تو میوزک ہال میں قرآن گایا کیجئے

کل کا آٹا ہے نل کا پانی ہے
آب و دانے کی حکمرانی ہے

دعویٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو
طولِ شبِ فراق ذرا ناپ دیجئے

آنر کے ساتھ نام گرامی بھی لکھ گیا
یعنی ادھر سے خط غلامی بھی لکھ گیا

کالج میں دھوم مچ رہی ہے پاس پاس کی
عہدوں سے آرہی ہے صدا دور دور کی

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

شوقِ لیلائے سول سروس نے مجھ مجنون کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

کیونکر خدا کے عرش کے قائل ہوں یہ عزیز
جغرافیہ میں عرش کا نقشہ نہیں ملا

آج بنگلے میں مرے آئی تھی آوازِ اذاں
جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

عادت جو پڑی ہو ہمیشہ سے وہ دور بھلا کب ہوتی ہے
رکھی ہے چونٹی پاکٹ میں پتلون کے اندر دھوتی ہے

ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں، ہر موڑ پہ اک لیسنس طلب
اس پارک میں آخر اے اکبر میں نے تو ٹہلنا چھوڑ دیا

لکھے گا کلک حسرت دنیا کی ہسٹری یہ
اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں

کیا ہے باقی جناب قبلہ میں
کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے

سو وہ ڈنڈا بھی اب ہے ضبطِ پولیس
ہے زباں گرم قلب ٹھنڈا ہے

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں
مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

باہم شبِ وصال غلط فہمیاں ہوئیں
مجھکو پری کا شبہہ ہوا اُن کو بھوت کا

صاحب میں سب برائی لیکن وہ خوب چوکس
گاندھی میں سب بھلائی لیکن محض وہ بے بس

آپ منکر ہیں غلامی بھی نہیں ملتی ہے
سلطنت کر گئے عقبےٰ سے ڈرانے والے

اسلام کو جو کہتے ہیں پھیلا بزورِ تیغ
یہ بھی کہیں گے پھیلی خدائی بزورِ قوت

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

کیا خبر خلد سے کیوں حضرتِ آدم نکلے
ہم تو مشغول ہیں گیہوں کی خریداری میں

کہتے ہیں مغلوب ہے اکبر خیالِ حور سے
کہہ دو یہ بہتر ہے چھوٹے لبکٹوں کے جوڑے

پردہ اٹھتا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں
حوریں کالج میں پہونچ جائیں گی غلمان تو ہیں
کٹ گئی ناک حرم میں تو نہیں کچھ پروا
ٹھینگا یہ "ڈیر" میں سننے کے لئے کان تو ہیں
خاصدان آگے بڑھا کر مری باتوں پہ کہا
آپ کیوں جان مری کھاتے ہیں پان تو ہیں

اقوالِ زرّیں

(۱) جو شخص اپنی زبان کو محفوظ رکھتا ہے وہ اپنی آبرو کو بچائے رکھتا ہے۔ (حضرت علیؓ)

(۲) دنیا میں مجھے اگر ایک آدمی بھی ایسا مل جائے جو اپنے نفس کا غلام نہ ہو تو میں اسکو اپنے دل کے معزز ترین گوشے میں جگہ دونگا (شیکسپیر)

(۳) صرف وہی لوگ قابلِ احترام جن کے افعال اور اقوال، انسانی ضروریات کے معاون ہوتے ہیں اور رہم کو غارتگری سے نکال کر شہرت کی بلندی پر پہونچا دیں۔ (لانگ فیلو)

(۴) متردد انسان ہمیشہ ذرا سی مصیبت کو بڑی محسوس کرتا ہے اور اپنی حالت انجام کار بد سے بدتر بنا لیتا ہے۔ (ڈکنس)

امام المتغزلین

کامل عثمانی (درجہ دوازدہم)

تونے حسرت یہ نکالا ہے عجب رنگ غزل — اب بھی کیا ہم تری یکتائی کا دعویٰ نہ کریں

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد غزل گوئی نے جس فضا میں سانس لی اس کے ہر ہر گوشے میں امیر و داغ چھائے ہوئے تھے۔ ہماری شاعری محض رسمی و تقلیدی قسم کی رہ گئی تھی۔ شاعری خیالات و جذبات کی نہ تھی بلکہ زبان اور محاورے ردیف اور قافیہ کی تھی۔ "تنگنائے غزل" سے محدود تر ہو گئی تھی اور اپنی تمام خوبیاں کھو کر تیزی سے انحطاط کی طرف مائل تھی۔ انگریزی ادب کی روشناسی اور اردو ادب کی بے مائگی نے حالی اور آزاد کو نظم کا چراغ روشن کرنے پر مجبور کر دیا تھا جس کے سامنے نہ صرف غزل کی روشنی ماند ہو رہی تھی بلکہ آخری سانسیں لے رہی تھی۔ اس کے کچھ عرصے بعد حسرت کی شاعری کا غلغلہ بلند ہوتا ہے اور وہ یہ کہتے ہوئے اٹھتے ہیں۔

اے وہ کہ تجھے شوق ہے تحسین سخن کا — میرا جو کہا مان تو حسرت کی غزل دیکھ

اور موجودہ غزل گوئی کی بنیادیں ڈالتے ہیں جس کی مقبولیت کو انگریزی ادب کی اندھی تقلید اور نظم کی روز افزوں ترقی بھی کوئی دھکا نہ پہونچا سکی۔

لیکن حسرت موہانی کا کمال عام نگاہوں سے بہت حد تک پوشیدہ ہے بظاہر ان کے یہاں کوئی ایسی خوبی نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے ان کو کلاسکل حیثیت حاصل ہے۔ ان کی ہستی دوسرے شعرائے متغزلین سے کسی طرح منفرد نظر نہیں آتی۔ ان کو موجودہ غزل گوئی کا امام کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری نئے رجحانات و احساسات کی حامل بتائی جاتی لیکن جب ہم ان کی غزلیں پڑھتے ہیں مثلاً۔

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا — کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا
بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں — ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا
پڑھ کے تیرا خط عجب دل کی مرے حالت ہوئی — اضطراب شوق نے ایک حشر برپا کر دیا
ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرم نیاز — تجھکو آخر آشنائے ناز بیجا کر دیا
اب نہیں دل کو کسی صورت کسی پہلو قرار — اس نگاہ ناز نے کیا سحر ایسا کر دیا
کیوں نہ ہوں تیری محبت سے منور جان و دل — شمع جب روشن ہوئی گرم تماشا کر دیا
تیری محفل سے اٹھاتا غیر مجھکو کیا مجال — دیکھتا تھا میں کہ تونے بھی اشارا کر دیا

تو دیکھتے ہیں کہ وہی پرانی حسن وعشق کی داستان ہی، دل کی بیتابی کا بیان ہی، خط اور اضطراب شوق کا ذکر ہے ناز و نیاز کا تذکرہ ہی، نگاہ ناز کے سحر سے دل کی بیقراری کا ماجرا ہے، محفل ہے، شمع ہے، رقیب ہے۔ بظاہر یہ شاعری آتش و ناسخ، امیر و داغ کے رنگ میں جذب ہوتی نظر آتی ہی۔

لیکن نہیں نہیں۔ اسے مکرر پڑھیے حسرت محض ناظم نہیں نظر آتا بلکہ ہر شعر شعریت سے اس قدر مملو ہے کہ زبان پر جاری ہوتے ہی دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہی۔ معمولی غزل کے شعر نہیں ہیں بلکہ ہر شعر میں تغزل کی پُرکیف تاثیر ہے۔ خیالات وہی ہیں لیکن حسرت نے ان میں تاثیر بھر دی ہے۔ تخیل وہی ہے لیکن مردہ نہیں حسرت کے جوش بیان نے اس میں زندگی کی روح سمو دی۔ جذبات وہی ہیں لیکن حسرت کے قلم نے ان میں اصلیت کا رنگ چوکھا کر دیا طرز ادا وہی ہے۔ لیکن تصنع اور آورد سے خالی حسرت کی سادہ پرکاری نے اس سے اصلی شان تغزل پیدا کر دی ہے حسرت کے یہاں تصوف اور فلسفہ کی گہرائیاں نہیں بلکہ وہ صرف واردات قلبیہ کا بیان کرتے ہیں۔ ان کا محبوب ان کا عشق تخیل کی پیداوار نہیں بلکہ ان کی نزدیکی خالص جمالیاتی کیف پیدا کرتی ہی اور ہم کو تھوڑے وقفے کے لیے دنیاوی تفکرات سے بیفکر کر کے خالص شعر و ادب کی دنیا میں پہونچا دیتی ہے۔ حسرت وہی زبان اور محاورے استعمال کرتے ہیں لیکن خیالات کی ہم آہنگی ان میں شیرینی پیدا کر دیتی ہے۔ حسرت کی اُستادانہ پختگی الفاظ کو اس طرح ترکیب دیتی ہی کہ ان کا ترنم شعر کو ایک لطیف نغمہ کی حیثیت دیتا ہی۔ حسرت کی آواز نئی نہیں لیکن وہ دل سے نکلتی ہے اور دل میں اُتر جاتی ہے غرضکہ حسرت کی شاعری نے ان تمام چیزوں سے متصف ہو کر غزل کے مردہ جسم میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اور یہی چیز ان کو امام المتغزلین کہلواتی ہے۔

اقوالِ زرّیں

(۱) حُسن صداقت ہے اور صداقت حُسن ہے۔ (کیٹس)

(۲) کامیابی سے زیادہ کوئی کامیاب شئے نہیں۔ (فرائڈ)

مہجور پپیہا

احسن

جدید اردو شاعری میں شاید ہی کوئی ایسی فرد نظر آئے جس کی نظمیں اسقدر دقیق ہوں جتنی کہ آنی جی جالسی کی۔ ان کی نظم "مہجور پپیہا" پیش کی جاتی ہے۔ اردو میں نیچر پر نظمیں کم ہیں۔ آنی صاحب کی حقیقت بین نظر نے اس میدان میں کیسی کامیابی حاصل کی ہے، وہ شاید میں مندرجہ ذیل سطور سے جوں توں سمجھا سکوں مگر قبل اسکے کہ میں تنقید پر آؤں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ پوری نظم یہاں لکھ دوں تاکہ پڑھنے والوں کو نقوش آنی کی ورق گردانی کی زحمت نہ پڑے اور اس وجہ سے بھی کہ تنقید کے ساتھ ساتھ اگر نظم بھی ہو تو لطف بڑھ جاتا ہے۔

کس قدر دلچسپ کیسا دلکشا منظر ہے آہ — جھومتا آتا ہے مستوں کی طرح ابرِ سیاہ
سوچتے ہیں بادہ کش بیٹھے ہوئے عذرِ گناہ — دیکھ لینا اب ہو گا ان سے توبہ کا نباہ

لالہ و گل کی لہک ہے دامنِ کہسار میں — شعلۂ الفت بھڑک اٹھا ہے قلبِ زار میں
برق چمکی کالے کالے ابرِ دریا بار میں — یا امیدِ وصل ہے فرقت کے عہدِ تار میں

یہ پرندوں کی صدا سے گونجتا ہے آسماں — طعنہ زن یا باغِ جنت پر ہے گلزارِ جہاں
ایک جانب گونجیں افسانہ سنجِ بوستاں — دل کو برماتی ہے اک جانب پپیہے کی فغاں

سچ ہے اہلِ مدعا ہونا مصیبت ہے بڑی — آفتیں رہتی ہیں آئے دن درِ دل پر کھڑی
نالہ یوں لیکن کہاں کرتا ہے کوئی ہر گھڑی — اے پپیہے، تجھ پہ آخر ایسی کیا بپتا پڑی

اس قدر دل دوز ہو فریاد جس کی الاماں — کیا غضب ہوگی خدا جانے پھر اسکی داستاں
سنتے ہیں اک عمر سے ہم تو یہی شورِ فغاں — پی کہاں ہے پی کہاں ہے پی کہاں ہے پی کہاں

کچھ نہیں ہم بھی تو کسکی دھن میں آوارہ ہے تو — ڈھونڈھتا ہے کس کو یوں صحرا الصحرا سو بسو
ہر نفس تیرا ہے پائے سعیِ راہِ جستجو — ہر صدا بانگِ درائے کاروانِ آرزو

تو سراپا شوق بن کر پھرتا ہے دیوانہ وار — یا کیا ہے شوق نے خود تیرا قالب اختیار
تیری ہر آواز میں ارمان مضمر ہیں ہزار — آہ اک سازِ تمنا ہے کہ ہے تیری پکار

خیمہ زن ابرِ بہاری زیرِ چرخِ پیر ہے — یا دھواں ہے تیری آہوں کا کہ عالم گیر ہے
تو ہوا میں ہے کہ میری آہ خوش تدبیر ہے — عازمِ عرشِ معلٰی در پئے تاثیر ہے

تو دلِ عاشق ہے، تیری جان دردِ آرزو — اور ہے گرم تیری نبض سردِ آرزو
تو چلا ہے اڑ کے اے صحرا نوردِ آرزو — یا اڑا ہے روح بن کر رنگِ زردِ آرزو

اے کہ تیرے واسطے بسطِ فضا عمانِ ہجر — تجھ کو ہر موجِ ہوا اک موجۂ طوفان ہے
تو اکیلا ناخدا، کوئی نہ کشتی بانِ ہجر — اُف یہ جانِ زار، یہ دریائے بے پایانِ ہجر

اے وجودِ مضطرب، اے مظہرِ شانِ فراق — صبر کر مٹ جائے گا یہ دورِ دورانِ فراق
آرزوئیں یوں اگر ہیں دشمنِ جانِ فراق — اک نہ اک دن چاک رکھا ہے گریبانِ فراق

عجب کیف ہے! عجب عالم ہے۔ 'اسی کیف' اسی عالم کا نام شاعری ہے۔ شاعر محض لفاظی یا محض عکس کشی نہیں کر رہا ہے بلکہ نیچر کے خزانے میں جس چیز پر اس نے نظر ڈالی ہے اس کی تہ تک پہونچ گیا ہے اس نے الفاظ کے زور سے خیالات واحساسات کی ایک لطیف نئی دنیا بنا دی ہے جو ہماری دنیا سے اس قدر مشابہ ہے کہ دونوں میں سر مو فرق نہیں معلوم ہوتا۔ نیچر کا نقشہ اس کمال سے کھینچا ہے کہ گہری نظریں فوراً دیکھ لیتی ہیں۔

شاعر آرزو کا مجسمہ دنیا کی جکڑ بندیوں میں ڈسا ہوا 'پی کہاں'، 'پی کہاں' کہتا ہوا نیچر کی طرف جاتا ہے۔ دلکشا منظر اور لالہ و گل کی لہاب دیکھکر اسکا شعلۂ الفت بھڑک اٹھتا ہے، وہ آگ لگی جس کو دنیا کے معاملات نے دبا رکھا تھا۔ پھر شعلہ فگن ہوتی ہے۔ ایک ہمنوا پپیہے کی صدا کان میں آتی ہے۔ دونوں ایک ہیں دونوں کا دل ایک ہی آگ سے جل رہا ہے مگر شاعر اس قدر بے صبر نہیں ہے جتنا کہ پپیہا اور اسی لئے وہ خیال کرتا ہے کہ پپیہے کی داستان شاید شاعر کی کہانی سے زیادہ دلدوز ہے۔ کچھ سوالات کے بعد شاعر سمجھ جاتا ہے کہ:۔

ہر نفس تیرا ہے پائے سعیِ راہِ جستجو — ہر صدا بانگِ درائے کاروانِ آرزو

اب کیا رہا، پپیہا "سراپا شوق نظر آتا ہے اور اس کی پکار اک سازِ تمنا" اس کی آہوں کا دھواں بادل بنکر آسماں پر چھا جاتا ہے۔ پوری نیچر ایک میدانِ آرزو یا صحرائے آرزو ہے جس میں پیلا رنگ "زردِ آرزو" بنکر اڑتا پھرتا ہے۔ ہجر کا طوفان موجیں مارتا ہوا سامنے آتا ہے مگر پپیہا اس طوفان کا شناور ہے۔ اس کے چھوٹے سے دل میں یہ چھوٹی سی اُمید پورے طوفان کا مقابلہ کرانے کے لئے کافی ہے :-

آرزوئیں یوں اگر ہیں دشمنِ جانِ فراق　　　اک نہ اک دن چاک رکھا ہے گریبانِ فراق

پپیہا شاعر کی زندگی کا ہی نہیں بلکہ ہر شخص کی زندگی کا نمونہ ہے جو زندہ ہے۔ کیا ہماری ہر سانس میں "پی کہاں، پی کہاں" کی آواز نہیں آتی۔ اگر نہیں آتی تو ہم انسان نہیں ہیں۔ ہمارا مدعا کچھ ہو ہماری تدبیریں کچھ ہوں مگر شاعر کو (particulars) سے کوئی غرض نہیں اس کو (Universal) کی تہ تک پہونچنا ہے اور وہ وہاں تک پہونچ گیا ہے۔ اس کی نظر عالم کی گہرائی تک پہونچ ہی نہیں گئی بلکہ اس کے الفاظ نے اس الفاظ کو ہماری آنکھوں کے سامنے بھی پیش کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ نیچر کی کتاب سے شاعر نے ایک ورق پھاڑ لیا ہے۔

اردو ادب میں نیچر کے خوشنما مناظر کی عکس کشی مثنوی نویسوں اور مرثیہ گوؤں نے بہت ہی کچھ کی ہے مگر نیچر کی اس گہرائی تک شاید ہی کوئی پہنچا ہو۔ یہ نظم انگریزی ادب کے رومینٹک Romantic شاعروں کے کلام سے ملتی جلتی ہے پوری نظم ورڈسورتھ "Wordsworth" کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ وہی نیچر، وہی شاعر ہے اور وہی نیچر کا تسلی بخش سبق انسان کے لئے وہی Passions کے تموج میں امید کا ایک تنکا' جو تیرتا پھرتا ہے اور جس کو کوئی طاقت تہِ آب نہیں لیجا سکتی۔ ہ "اے وجودِ مضطرب اے مظہرِ شانِ فراق ؛ صبر کر مٹ جائے گا یہ دور دورانِ فراق"

کہیں کہیں پر شیلی "Shelley" کی خاص طرز یعنی مادی چیزوں کو روحانی مجسمہ دینا" بھی یاد آتی ہے جیسے کہ اس مصرع میں "یا بنا ہے روح بنکر رنگِ زردِ آرزو"۔ یا پپیہے کو "وجودِ مضطرب" یا اس بند پر "کچھ سنیں ہم بھی...... الخ" تو شیلی Shelley کا وہ بند یاد آجاتا ہے جسمیں اسکائی لارک "Skylark" سے اس نے پوچھا ہے:-

What objects are the fountains
Of thy happy strain ?
What fields, what waves what mountains ?
What shapes of sky are plain ?
What love of thine own kind ?
What ignorance of pain ?

مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ مانی صاحب انگریزی شاعری سے از بس ناواقف ہیں، انھوں نے کبھی ورڈسورتھ اور شیلی "Shelley" کا نام بھی نہیں سنا ہے مگر انکا فلسفۂ نیچر ان شاعروں سے کسی قدر مشابہ ہے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مانی صاحب بھی نیچر کی اسی گہرائی تک پہونچ گئے ہیں .... جس گہرائی تک ورڈسورتھ اور شیلی پہنچے تھے اور نیچر کے universal اصول ہر جگہ ایک ہیں۔

اکبر اعظم اور مذہبی رجحانات

سید احمد زیدی (درجہ دوازدہم)

اس سے پیشتر کہ اکبر کے مذہبی رجحانات کا تعین کیا جائے اور ان کی نوعیت پر بحث کی جائے یہ بتا دینا بہتر ہوگا کہ اکبر کے رجحانات شروع سے آخر تک یکساں نہیں رہے بلکہ وقت اور زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ بھی بدلتے رہے۔ لہذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تاریخ و سن کا سلسلہ جو ہم نے اکبر کی مذہبی تبدیلیوں کو واضح کرنے کے لیے استعمال کیا ہے کس حد تک یقینی ہے یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ کس سن سے کس سن تک بادشاہ کے کیا عقائد تھے۔ لیکن پھر بھی مورخین نے صحیح تاریخ معلوم کرنے میں کافی جستجو کی ہے۔ اور قیاس کیا جاتا ہے کہ وقت اور مدت کی قائم کردہ حدود اگر بالکل صحیح نہیں ہیں تو بھی قریب قریب صحیح ضرور ہیں اکبر کے مذہبی رجحانات میں گاہے بگاہے تبدیلی ہوتی رہی اور اس کے مذہبی رجحانات کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا دور ۱۵۵۶ء سے ۱۵۷۹ء تک

اس دور میں بادشاہ کے عقائد بالکل اسلامی رہے۔ اکبر اس زمانہ میں اکثر مسلمان فقیروں کے مزارات پر زیارت کے لیے جاتا تھا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ پر آگرے سے اجمیر تک پیدل سفر کرتا تھا جب حاجیوں کے قافلے جاتے تھے تو یہ ان کو الوداع کہتا تھا۔ ایک دفعہ جب قافلہ کو رخصت کیا تو عین حالت حج کی وضع بنائی وہی دو چادروں کا لباس ننگے سر ننگے پاؤں تھوڑی دور قافلہ کا ساتھ دیا۔ اور جب آواز بلند لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ کہنا شروع کیا تو دیکھنے والوں پر ایک کیفیت طاری ہوگئی اور اس انبوہ سے آواز نالہ و زاری بلند ہوئی اور جب حاجی واپس آتے تھے تو اکبر اپنی انتہائی خوشی کا اظہار کرتا تھا۔ اس زمانہ میں اکبر کی حکومت مولویوں کے زیر اثر تھی اور مذہبی پارٹی کے لیڈر صدر الصدور کہلاتے تھے شیخ مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی صدر تھے۔

دوسرا دور ۱۵۷۹ء سے ۱۵۸۲ء تک

یہ وہ دور شروع ہوتا ہے جس دور میں اکبر کے دماغ میں آہستہ آہستہ تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوگئی تھی مورخین اس کے مختلف وجوہ بتاتے ہیں۔ اس زمانہ میں اکبر نے دوسری مذاہب کے لوگوں سے تبادلہ خیال شروع کیا۔ ۱۵۶۲ء میں اکبر کی شادی جے پور کے راجہ بہاری مل کی لڑکی سے ہوئی اگر چہ یہ شادی بادی النظر میں ایک سیاسی شادی کا

تھی لیکن راجپوت شہزادی کی محل شاہی میں موجودگی ایک اہم واقعہ تھا اور اکبر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا ۱۵۶۳ء میں جبکہ وہ شکار کھیل رہا تھا تو اس نے اس علاقہ کا خراج معاف کر دیا ۱۵۶۴ء میں جزیہ معاف کیا اور ہندوؤں کے ساتھ عمدہ سلوک کی ابتدا کی۔ اہل ہنود خیال کرنے لگے کہ اب حکومت بابر کی حکومت نہ رہی بلکہ کسی ہندوستانی بادشاہ کی ہوگئی ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ اکبر کو صوفی کتابوں سے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا اور تصوف اس کی پسندیدہ چیز بن گئی۔ ۱۵۶۷ء میں اکبر کے دربار میں فیضی پہونچا اور ۱۵۷۴ء میں ابوالفضل داخل ہوا۔ ان دونوں کے خیالات نے بادشاہ پر گہرا اثر ڈالا۔ اب اس کا دماغ سچائی کی جانب راغب ہوا اور مذہب کے بارے میں نئے نئے خیالات پیدا ہونا شروع ہوگئے۔ بادشاہ پر ان باتوں کا ایسا اثر ہوا کہ بے سوئے راتیں گزار دیتا تھا۔ فتحپور سیکری میں ایوان شاہی کے پاس سب سے الگ ایک عمارت بنا کر عبادت خانہ نام رکھا اور وہاں اکیلا رات کو شب بیداری کرتا تھا یا ہو اور یا ہادی کے نعرے لگاتا اور ایک پتھر کی سل پر بیٹھ کر جو محل کے دروازے کے سامنے پڑی ہوئی تھی نور سحر سے دل روشن کرتا۔ ہر طبقہ کے علماء میں بحث و مباحثہ ہوتا مگر اس کا نتیجہ اچھا نہ نکلا۔ علماء میں ایک دوسرے کے مذہب پر چوٹیں ہونے لگیں جس کا نتیجہ خراب نکلا ۱۵۷۸ء میں علماء میں دو گروہ ہو گئے جن میں سے ایک سبطی کہلایا اور قبطی کے نام سے موسوم ہوا اس زمانہ میں ملحدانہ خیالات رکھنے والوں نے اکبر کے کان بھر دیئے کہ مذہب اسلام میں تو کچھ رکھا ہی نہیں ہے اور نہ اس مذہب کی کچھ حقیقت ہے ۱۵۷۸ء تک بادشاہ نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کون سا مذہب اچھا ہے لیکن وہ اس میں ناکامیاب ہوا جس کی وجہ صرف علماء کے آپس کے جھگڑے تھے۔ اور دوسرا سبب علمیت کا کم ہونا تھا کیونکہ وہ معمولی صلاحیت کے آدمیوں سے گھرا رہتا تھا جس کی بنا پر بادشاہ کے شکوک بڑھتے جاتے تھے اور پانچ چھ سال کے بعد اکبر کے دل سے اسلامی جذبات ختم ہوگئے۔

دین الٰہی ۔ جب بادشاہ کو ان مذہبی مباحثوں سے تسلی نہ ہوئی تو اس نے بذات خود ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی جس میں ہر مذہب کے اچھے اصول رکھے اکبر خود خلیفۂ خدا بنا جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے "لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ" اور اپنا خلیفہ ابوالفضل کو بنایا۔ اب بادشاہ کی حیثیت ایک امام کی حیثیت بن گئی۔ سب علماء نے فتویٰ دے دیا کہ بادشاہ کی رائے ہر مذہبی معاملے میں افضل ہے یہ فتویٰ بعض علماء نے بادشاہ کے ڈر سے اور بعض نے خوشامد کے لئے دیدیا اور فتوے میں اس امر کا اعتراف کیا گیا کہ بادشاہ امام عادل ہے اور مجتہد سے افضل ہے۔ اس مذہب کے خاص کارکن راجہ بیربل اور ابوالفضل تھے۔ لیکن اس مذہب میں سوائے بڑے آدمیوں کے عوام الناس داخل نہیں ہوئے اور اول الذکر اشخاص نے بھی بعض مصلحتوں کی بنا پر اپنا لیا۔ اس مذہب کے آدمی جب ایک دوسرے سے ملتے تھے تو کہتے "اللہ اکبر" اور "جل جلالہ" یہ کلمات بجائے سلام کے استعمال ہوتے تھے اس مذہب کی بنا پر اکبر کی ہر دلعزیزی باقی رہی، اس مذہب کا جزو اعظم عظمت آفتاب تھا۔ حکم ہوا کہ شراب اتنی پیو کہ بدمست نہ کردے

شیر اور سور شجاع جانور ہیں اس لیے ان کا گوشت بھی شجاعت بخشتا ہے۔ دراصل یہ ترکیب شیخ مبارک کی تھی اور اس سے صرف ان کا مقصد مولویوں کے اقتدار کو کم کرنا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ مبارک نے ایسا کرنے میں بڑی زبردست غلطی کی کیونکہ آئندہ چل کر ایک ایسا دور آیا کہ اکبر کا رجحان مذہب اسلام کی جانب سے بالکل تبدیل ہو گیا اور وہ اسلام کی برائیاں سُننا پسند کرنے لگا۔

تیسرا دور ۱۵۸۲ء سے ۱۵۹۷ء تک

یہ دور اکبر کے رجحانات کا آخری دور تھا۔ اس زمانہ میں دوسرے مذہب کے لوگ آنے شروع ہو گئے یا بعض کو خود اس نے دعوت نامے بھیجکر بلایا۔ جیسا کہ آزاد لکھتے ہیں ملک فرنگ سے پادری اور بابا آئے اور انھوں نے کتاب آسمانی پیش کی گجرات کی طرف سے آتش پرست آئے حکم ہوا کہ قدیم رسم فارسی کے بموجب آتشکدہ بنے اور اسکی آگ ہرگز نہ بجھنے پائے۔ دفتر سے سن ہجری موقوف ہو کر سن الٰہی اکبر شاہی قائم ہوا۔ بلکہ کل اکبری آئین کا نام آئین الٰہی رکھا گیا اسکے ساتھ ساتھ بادشاہ نے برہمنوں کو بھی بلانا شروع کیا برہمنوں نے اکبر پر ایسا رنگ جمایا کہ اسکے دل پر آواگون کا مسئلہ بالکل نقش ہو گیا اور وہ یہ کہنے لگا کہ جس مذہب میں آواگون نہیں وہ مذہب بیکار ہے۔ وہ لوگ مذہب اسلام کی برائیاں کرتے اور اکبر اُن کو سُن سُنکر خوش ہوتا مولانا آزاد قصص ہند میں لکھتے ہیں ایک بالاخانہ خوابگاہ کہلاتا تھا اکبر خود اس میں بیٹھتا تھا اور ایک برہمن کو جس کا نام دیبی تھا چارپائی پر بٹھا کر اسمیں رسیاں باندھتے اور کھینچ لیتے تھے وہ معلق رہتا اور آفتاب۔ ستاروں اور دیوتاؤں کے منتر سکھایا کرتے تھے چنانچہ تسخیر آفتاب کا منتر اور اسکے ایک ہزار ایک نام سیکھ کر پڑھنے شروع کئے۔ چند روز کے بعد قبلۂ عالم سے مہابلی بنگئے اسلام کی رسموں کو سلام کر کے ڈاڑھی کے ساتھ رخصت کر دیا۔ گائے کا گوشت اور لہسن پیاز وغیرہ بہت سی چیزیں حرام اور بہت سی حلال ہو گئیں۔ بلکہ جب والدہ کا انتقال ہو گیا تو پندرہ ہزار اہل دربار کے ساتھ بھدرا[۱] کروایا۔ غرضکہ اکبر نے اب آگ چاند اور سورج کی پوجا شروع کر دی تھی جس کے بارے میں عیسائی پادریوں کی ڈائری اور ان کے صفحات بتلاتے ہیں۔ عبادت کا ڈھنگ بھی اکبر نے بالکل نرالا رکھا تھا یعنی آفتاب کے سامنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھکر کھڑا ہوتا۔ کبھی اُچھلتا کبھی چکر کھا کر کانوں پر مکے مارتا اور سر کو تالو پر سے منڈاتا کہ بزرگوں کی روح تالو میں سے نکلا کرتی ہے۔ اسکے کچھ عرصہ کے بعد اکبر کی مصاحبت شیخ تاج الدین سے ہوئی اسنے بادشاہ کو نئی نئی باتیں بتائیں شیخ تاج الدین بھی قلعہ میں ایسے ہی بلوایا جاتا تھا جس طرح وہ برہمن تعلیم دینے کے لیے آتا تھا۔ اسکے عقائد مسلم عقائد کے خلاف تھے اسنے بادشاہ کو بتلایا کہ بادشاہ ہر زمانہ میں خدا کی طرف سے بھیجا جاتا ہے اسنے کہا کہ بادشاہ کو سجدہ کرنا روا ہے اسلیئے بادشاہ کے چہرہ کو قبلۂ حاجات اور کعبۂ مرادات قرار دیا اس سے اکبر کے دل میں اور نئے قسم کے خیالات پیدا ہو گئے۔ تاریخ شہادت پیش کرتی ہے کہ اکبر کے مذہبی رجحانات از ابتدا تا انتہا ایک نہ تھے بلکہ زمانے کی ہواؤں کے ساتھ ساتھ مرغ قبلہ نما کی طرح اسکے رجحانات بھی بدلتے رہے۔

[۱] تمام چہرہ کے بال بالکل صاف کر ڈالنا بھدرا کہلاتا ہے۔

انتقام

"ایک اصلاحی افسانہ"

مرزا محمود حسین
"درجہ یازدہم"

زبیدہ ایک معصوم لڑکی تھی، دنیا کے مکر و فریب اور تصنع سے ناآشنا، وہ اپنی ایک چھوٹی سی دنیا الگ بسائے ہوئے تھی۔ اس کے چھوٹے سے گاؤں میں دنیا کی دلچسپیاں سما گئی تھیں۔ وہاں کی ہوا شہر کی گندی اور کثیف ہوا سے کہیں زیادہ پاک صاف تھی۔ وہاں کے لوگ خوشی اور اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے، زبیدہ ایک کاشتکار کی بیٹی تھی۔ وہ اُن مسرتوں اور دلچسپیوں سے ناآشنا تھی جو اس کی ہمسن لڑکیاں شہروں میں عالیشان زندگی بسر کرنے میں محسوس کرتی ہیں۔ لیکن وہ خوش تھی اور ایسی خوشی کی مالک جسکو رئیس اپنا خزانہ لٹا کر بھی حاصل نہیں کر سکتے ممتاز اس کی خوشی کا ساتھی تھا۔۔۔۔ نہیں بلکہ اسکی زندگی کا سہارا اور اُسکے دل کا مالک تھا۔ زبیدہ اور ممتاز دونوں ایک ہی مندر کے دیوی اور دیوتا تھے۔ زبیدہ اپنے دیوتا کی پوجا کرتی تھی اور ممتاز اپنی دیوی پر ہار چڑھاتا تھا۔ دونوں کی زندگیاں ایک دلکش خواب کی طرح گذرتی رہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف کھنچتے گئے۔ فرق اتنا ہوا کہ زمانے کے ساتھ ساتھ زبیدہ کی شرارت و شوخی، شرم و حیا میں تبدیل ہوتی گئی، لیکن اس کی نیچی نظروں، بات چیت کے شرمیلے انداز سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے جوانی کی منزل میں قدم رکھا ہے۔ اب ممتاز اٹھارہ سال کا جوان اور زبیدہ چودہ برس کی دوشیزہ تھی لیکن زندگی کے لمحات کے ساتھ ساتھ دونوں کے دل محبت کی بندشوں سے جکڑتے گئے، زبیدہ کا چھوٹا بھائی سلیم بھی ممتاز کو بہت چاہتا تھا۔ ممتاز اور زبیدہ کی محبت نے دو خاندانوں میں میل و محبت کا بیج بو دیا تھا۔ ممتاز کا بڈھا باپ زبیدہ کو اپنی لڑکی کی طرح پیار کرتا تھا اور زبیدہ کے گھر والے ممتاز کو اپنے ہی کنبہ کا ایک فرد شمار کرتے تھے۔

یہ موسم گرما کا ذکر ہے جبکہ ممتاز کی منگنی زبیدہ سے قرار پائی اور شادی اسی سال ماہ اکتوبر میں فصل کی تیاری پر ہونے والی تھی۔ یہ ایک منحوس زمانہ تھا جبکہ ایک آوارہ زمیندار الطاف کا قدم اُس پاک گاؤں میں آیا۔ اسکی ناپاک سانسوں نے گاؤں کی پاک و صاف ہوا میں زہر پھیلا دیا۔ اس کی چالاکیوں اور مکاریوں نے گاؤں کے بھولے بھالے دلوں کو مکر و فریب سے بھر دیا۔ الطاف کی کوٹھی زبیدہ کے کھیت سے تین میل کے فاصلے پر تھی۔ اندھیری راتوں میں بجلی کی روشنی کوٹھی [illegible] کھڑکیوں سے [illegible] کھیتوں پر پڑتی تھی [illegible]

سناٹے میں وہ کھینچی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ کبھی کبھی شرابیوں کی تکرار اور قہقہوں کی آوازیں کوٹھی میں گونجتی ہوئی سنائی دیتی تھیں۔ کیونکہ زمین جو انور کی اراضی سے ملحق تھی زبیدہ کے والد جمیل کی ذاتی ملکیت تھی اسلئے وہ بگڑے ہوئے زمیندار سے ڈرتے نہیں تھے بلکہ نفرت کرتے تھے لیکن ممتاز اور اسکا بڈھا باپ افتخار انور کے مزارعین تھے۔

ماہ جون میں ایک دن صبح کے وقت زبیدہ اکیلی اپنے کمرے میں بیٹھی تھی اسکا چھوٹا بھائی سلیم بھی پاس بیٹھا ہوا اپنے اسکول کا سبق یاد کر رہا تھا۔ زبیدہ کسی فکر میں غرق تھی، شاید وہ کسی آنیوالے کا انتظار کر رہی تھی ایکایک گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ اس کے چہرے پر مسرت کے آثار نمایاں ہوگئے۔ ہلکے سے تبسم کے ساتھ اس کے ہونٹھوں کو جنبش ہوئی اور آنکھیں کھڑکی کی طرف اُٹھ گئیں۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نے اسکے دل کی حرکت کو اور خون کی روانی کو اور تیز کر دیا۔ گھوڑا کھڑکی کے پاس آکر رکا۔ یکایک وہ جھجکی اور پیچھے ہٹی۔ بیس سالہ نوجوان جسکی آنکھیں نشے سے مخمور ہو رہی تھیں، زبیدہ کو گھور رہا تھا۔ زبیدہ کچھ کھوسی گئی تھی، کہ ایک آواز نے اُسے چونکا دیا "ارے کوئی اندر ہے؟" زبیدہ نے سلیم سے کہا "جاؤ پوچھو یہ کیا کہنا چاہتا ہے؟" سلیم باہر گیا اور کہا کہ ابا گھر پر نہیں ہیں آپ کو کیا کام ہے؟ انور نے سلیم کو پیارے گود میں اٹھالیا اور ایک روپیہ اسکے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا جاؤ تم بازار سے مٹھائی لے آؤ میں جبتک تمھارے یہاں بیٹھ کر جمیل کی راہ دیکھتا ہوں، مجھے بڑا ضروری کام ہے۔ بچہ شیطان کے بہکانے میں آگیا۔ اور خوشی خوشی بازار کو روانہ ہوگیا۔ انور جس کے دل میں ناپاک جذبات کا ہجوم تھا۔ بڑا طمینان سرت کیساتھ گھر میں داخل ہوا تھوڑی دیر میں سلیم واپس آیا سائیں نور کا گھوڑا لئے باہر تھا سلیم جیسے ہی مکان میں داخل ہوا اُسنے اپنی بہن کی چیخ سنی اور دوڑ کر کمرے میں گھس گیا۔ اُسے ایک روح فرسا نظارہ دکھائی دیا۔ زبیدہ کے بال پریشان تھے، چہرہ غصہ سے تمتایا ہوا تھا، آنکھیں غیظ وغضب سے سُرخ ہوگئی تھیں مگر وہ خاموش تھی۔ چارپائی کے کنارے پر بیٹھی ہانپ رہی تھی۔ سلیم نے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں سفید قطرے چمکتے ہوئے دکھائی دیرہے تھے۔ انور نہایت اطمینان سے اُٹھا اور باہر نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں ممتاز خوش خوش، سیٹی بجاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ لیکن گھر کی غمگین فضا نے اسمیں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا۔ زبیدہ نے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ انور کے گستاخانہ سلوک کو دُہرایا اور اپنی پاکبازی کا یقین دلایا۔ زبیدہ کے الفاظ نے ممتاز کے دل میں اک آگ سی لگا دی۔ وہ انور سے بدلہ لینے کی فوری تدبیریں سوچنے لگا اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔

شام کا وقت تھا گھر میں ہر طرف اضطراب پھیلا ہوا تھا۔ زبیدہ کی حالت دیوانوں کی حدتک پہونچ چکی تھی۔ اسی پریشانی میں زبیدہ کی نظر میز پر پڑی جسپر ایک چاک شدہ لفافہ پڑا ہوا تھا۔ زبیدہ نے لفافہ

اٹھایا۔ اسمیں سے ایک پرزہ نکلا جسپر یہ الفاظ درج تھے۔

"زبیدہ میں تمھیں خیرباد کہتا ہوں اور اس وقت تک واپس نہ ہونگا جبتک انور سے انتقام نہ لیلوں۔ چاہے یہ شعلۂ انتقام مجھے خود ہی جلا دے۔ انور کلکتہ بھاگ گیا ہے اور میں اُس کا انتظار کر رہا ہوں"

تمھارا ممتاز

زمانہ گذرتا گیا۔ انور کے نظر سے دور ہوجانے اور گھر والوں کے سمجھانے سے ممتاز کا جوشِ انتقام کچھ سرد پڑ چکا تھا۔ بسنت کا زمانہ آیا۔ چاروں طرف لہلہاتے ہوئے کھیت تھے، زرد زرد پھول آنکھو میں سمائے جاتے تھے۔ یہی زبیدہ اور ممتاز کی شادی کا زمانہ تھا۔ ممتاز کے بڈھے باپ افتخار نے اپنے بیٹے کی شادی کا سامان فراہم کیا اور ایک بار پھر ان دو گھروں میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ ممتاز اور زبیدہ خوشی کے آنسوؤں کے ساتھ ملے۔

ممتاز اور زبیدہ کی شادی کو ابھی ایک ہی ہفتہ ہوا تھا کہ ایک دن ممتاز سیٹی بجاتا ہوا باہر کو نکلا۔ پیچھے پیچھے اسکا کتا "پونو" بھی آرہا تھا۔ ممتاز خوش تھا، وہ جانتا تھا کہ زبیدہ کے ساتھ اس کی زندگی کے ہر لمحات خوشگوار گذریں گے۔ وہ اپنے کتے سے کھیلتا ہوا اپنی اراضی کی طرف بڑھا۔ دفعتاً ایک خرگوش جھاڑی سے نکلا اور کتا اسکے پیچھے لپکا۔ ممتاز سمجھتا تھا کہ اُسے اپنی اراضی میں بھی شکار کا حق حاصل نہیں اسلئے وہ کتے کو آوازیں دیتا اُسکے پیچھے دوڑا۔ اُسنے آوازیں دیں، سیٹیاں بھی بجائیں مگر کتا نہ مانا آخرکار اس نے ایک کھیت میں خرگوش کو مار ڈالا۔ یہ کھیت انور کی ملکیت میں تھا۔ عین اسی وقت انور دو باغبانوں کے ساتھ موقع پر آپہونچا اور ممتاز پر بلا سند بغیر اجازت شکار کھیلنے کا الزام لگایا۔ ممتاز پر مصیبتوں کے بادل پھٹ پڑے، جھوٹے گواہوں نے روپیہ کے آگے سر جھکا دیا اور یہ جیل کی چہار دیواری کی نذر کردیا گیا۔

ممتاز کا بڈھا باپ افتخار اپنے بیٹے کو جیل کی چہار دیواری کے باہر دیکھنے کو زندہ نہ رہ سکا اور نہ جمیل اپنی پیاری بیٹی زبیدہ کی مصیبتوں پر آنسو بہانے کو بچا۔ زمین مقدمہ کے ہاتھوں فروخت ہوچکی تھی اور کوئی مستقل آمدنی نہ تھی جس کی مدد سے کسی دوسری انصاف کی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا۔ وہ آگ جو ممتاز کے دل میں وقتی مسرتوں کی وجہ سے دب گئی تھی پھر سے بھڑک اُٹھی، وہ سمجھتا تھا کہ اسکے باپ افتخار اور خسر جمیل کی موت کا باعث صرف انور کی ذات ہے، اسلئے ایک خوفناک انتقام پر ہمہ تن آمادہ ہوگیا۔

جب ممتاز کی مدتِ قید ختم ہوئی تو زبیدہ اس کے استقبال کو گئی۔ ممتاز کی جدائی سے زبیدہ بالکل زرد ہوگئی تھی، آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ اُسے بہت سے دن فاقے سے بھی گذرے تھے، مگر ممتاز کو دیکھتے ہی

اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور اپنے نرم ہاتھ ممتاز کے ہاتھوں پر رکھ دیئے گویا کہ بہت دنوں کے بچھڑے ہوئے ساتھی مل رہے تھے۔

ممتاز اب بالکل بدل چکا تھا۔ وہ ہر وقت غمگین رہتا تھا۔ افلاس اور تنگدستی سے پیچھا چھڑانے کے لئے ممتاز نے نوکری کی کوشش کی۔ لیکن وہ زمانے کی نظروں میں ایک سزایاب ملزم کی حیثیت رکھتا تھا اسلئے ایک ملزم کے لئے کہیں جگہ نہ تھی۔ آخر کار ایک چونے کے بھٹے پر ملازم ہوگیا اور سلیم کو بھی اپنی ماتحتی میں لے لیا۔

ایک رات کو دس بج چکے تھے، چار دنطرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چاند اپنی پھیکی کرنوں سے بھٹہ کا دھندلا منظر پیش کر رہا تھا۔ ممتاز اور سلیم اپنے کاموں سے فراغت کر کے گھر جانے کو تھے کہ انور بھٹے کے پاس سے گذرتے ہوئے دکھائی دیا۔ ممتاز نے انور پر دلیرانہ حملہ کرتے ہوئے کہا "ظالم! تو نے مدتوں مجھ پر ظلم کئے مگر تو آج میرے بس میں ہے"۔ دونوں کو آپس میں گتھم گتھا دیکھکر سلیم نے ایک چیخ ماری۔ ممتاز نے سلیم سے خاموش ہوجانے کو کہا اور ادھر سے انور کو پیٹھ پر لاد کر بھٹے کی طرف بڑھا۔ بھٹا پورے شباب پر گرم تھا، تیز زرد اور سرخ رنگ کے شعلے چاروں طرف سے اٹھ رہے تھے۔ "رحم! رحم!!" ہلکی سی آواز انور کے منہ سے نکلکر فضا میں گونجی۔ مگر ممتاز اپنے ارادے سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹا اور انور کو بھٹہ کے لپکتے ہوئے شعلوں اور دہکتے ہوئے انگاروں کا لقمہ بنا دیا

مقدمہ کی سماعت میں صفائی کے کافی گواہ گذرنے کے باوجود بھی انور کا خون پکار اٹھا اور ممتاز کا جرم ثابت ہوگیا۔

ہفتہ کے دن زبیدہ بے ہوش پڑی رہی۔ جب بارہ کا گھنٹہ بجنا شروع ہوا تو چونک کر اٹھ بیٹھی اور گھنٹے کی آوازوں کو گننا شروع کیا۔ جب بارہواں گھنٹہ بجا تو اس نے کہا "ممتاز ٹھہرو! میں بھی تمہارے ساتھ آتی ہوں"۔ یہ کہکر ایک چیخ ماری اور زمین پر گر کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔

۔ یہ وہی وقت تھا جو وقت ممتاز کو پھانسی پر لٹکایا گیا تھا۔ افسوس،،

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بے کھلے مرجھا گئے

"شاہد"

سید محمد غلام حسین رضوی (درجہ دوازدہم)

اگر ذوق مکمل ہے کے ڈوبے ڈوبنے والا   جہاں ساحل نہیں ہوتا ہے ساحل ہو ہی جاتا ہے

مدن پور ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ جہاں چند گھر مسلمانوں کے بھی ہیں یہاں کے زمیندار صاحب اتفاق سے مسلمان ہیں۔ اور کٹر مسلمان، مذہب سے ان کو خاص رغبت ہے اُن میں قومی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس وجہ سے اس کی ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں اُن کے یہاں ہر وقت مذہب کا چرچا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گھر میں سب مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ بچے بھی مذہب کے بارے میں بہت کافی معلومات رکھتے ہیں ان کا بچہ شاہد تو سب سے بڑھا ہوا ہے گو ابھی بچپن ہے مگر روزے نماز کا بہت پابند ہے۔ شاہد کے بعد نجمہ کا نمبر ہے۔ یہ شاہد کی چچا زاد بہن ہے۔ نجمہ ہے تو شاہد سے عمر میں چھوٹی مگر کبھی اسنے نماز قضا نہ کی۔ دونوں میں حد درجہ کی محبت ہے۔ ایک دوسرے پر جان دیتے ہیں۔ بالکل اس شعر کی طرح گھل مل گئے ہیں۔ ؎

"من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی"
تاکس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری"

نجمہ اور شاہد کی بھولی بھالی باتوں سے والدین کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ ان کی میٹھی میٹھی باتیں سُنکر وہ پھولے نہیں سماتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ ہر وقت یہ دونوں بچے آنکھوں کے سامنے رہیں ایک لمحہ کی جدائی بھی پریشان کر دیتی۔ اس انتہائی محبت کا نتیجہ یہ ہوا کہ نجمہ اور شاہد کے والدین نے یہ طے کر لیا کہ ان کی آپس میں شادی کر دینگے تاکہ ہر وقت نظروں کے سامنے رہیں اور ہجر کے صدمات نہ اٹھانا پڑیں بہت ناز و نعم سے دونوں کی پرورش ہو رہی تھی اس طرح سے نجمہ اور شاہد مستقبل سے کوسوں دور حال کی رنگین فضاؤں میں سانس لے رہے تھے۔

رفتہ رفتہ بہار کا وہ زمانہ بھی آ پہونچا جب لڑکپن کی معصوم شوخیوں نے حجاب کی صورت اختیار کر لی تو بچپنے کا وہ الھڑپن سنجیدگی سے بدل گیا۔ اب محبت نے ایک دوسرا رنگ اختیار کر لیا۔ یہ بھی سُنا تھا کہ ایک دوسرے سے شادی ہو گی جس کی وجہ سے ایک دوسرے کے قدم بقدم چلتے تھے۔ اختلافات کو دور کر کے ایک جان دو قالب ہو گئے مگر ساتھ ہی ساتھ بزرگوں کا پاس ادب بھی تھا جس کی وجہ سے قصداً ایک دوسرے سے سختی کے ساتھ پردہ کرتے تھے نجمہ اور شاہد کبھی ساتھ ساتھ بزرگوں کے پاس نہ آتے۔ شرم و حیا اُن کا قدم تھام لیتی تھی۔ لیکن ایک دوسرے سے دُور دُور رہتے ہوئے بھی روحانی محبت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

ایک مرتبہ شاہد نے نجمہ سے پوچھا "بتاؤ تم میرے متعلق کیا کہتی ہو؟" نجمہ کی نیچی نظریں اوپر اٹھیں چہرے

پر شرم و حیا کی سُرخی دوڑ گئی نظریں نیچی کرلیں۔ شرمیلے انداز میں کہا "میرے دل و دماغ پہ چھائے ہوئے ہو تم۔ ذرّے کو آفتاب بنائے ہوئے ہو تم" "تم مجھکو کیوں چاہتے ہو شاہد؟ اب تو وہ بچپن بھی نہیں ہے کہ ساتھ رہنے کی محبت ہو۔ پیارے شاہد لڑکپن کا زمانہ بھی کیسا دلفریب ہوتا ہے۔ مجھے رہ رہ کے بچپن کی باتیں یاد آرہی ہیں جب ہم تم ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے کاش! پھر وہ حسین دن لوٹ آئیں۔

دو دن لوٹے جوانی دیدے ادھار بچپن　　　کھو گیا کدھر تو تیرے نثار بچپن

شاہد نے کہا کیا کہتی ہو نجمہ؟ مجھے خود نہیں معلوم۔ مگر ہاں اتنا جانتا ہوں کہ تم سے محبت ہے اور حقیقی محبت نجمہ! اس کا جواب تم کو خود معلوم ہے۔

"یہ بات، یہ تبسم، یہ ناز، یہ نگاہیں　　　آخر تمھیں بتاؤ کیونکر نہ تم کو چاہیں"

بولو نجمہ۔ بولو چپ کیوں ہو؟ ادھر دیکھو ادھر" نجمہ چونک پڑی معلوم ہوتا تھا کہ کسی گہرے خیال میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شاہد کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلک رہے تھے اور اس میں ڈبڈبائی ہوئی نجمہ کی نرگسی آنکھیں یہ کہہ رہی تھیں "شاہد! مجھے تم سے ایسی ہی امید تھی" شاہد نے پھر کہا "نجمہ! اچھا اور والد نے یہ طے کیا ہے کہ جب ہائی اسکول پاس کرلوں گا تب ہماری تمھاری شادی ہوگی۔ اس سے ہماری محبت اور پائدار ہو جائے گی۔ کیونکہ بہترین اور سچا عشق وہ ہے جس کا انجام شادی ہو۔ ہماری بھی شادی ہونے کو ہے۔ اس وجہ سے یہ محبت، یہ ہماری الفت بھی سچی اور بہترین ہے جس کا کوئی ثانی نہیں" نجمہ کا چہرہ فرط محبت سے چمک اٹھا۔ دونوں ہنستے ہوئے مکان کے مختلف حصوں کی طرف چلے گئے۔

گرمی کا زمانہ ہے۔ مارچ کا مہینہ، امتحان سر پر کھڑا! معمولی امتحان بھی نہیں بورڈ کا امتحان ہے۔ شاہد مکان کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا پڑھ رہا ہے مگر کبھی کبھی اُٹھ کر ٹہلنے بھی لگتا ہے۔ اکثر یہ بھی کہتا "امتحان میں پاس ہو گیا۔ مگر ہو سکتا ہے کہ رائے بدل جاوے۔ نجمہ کے ساتھ شادی نہ ہو تب کیا ہوگا؟ نہیں! نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا یہ لوگ اپنے وعدے کے خلاف نہ کریں گے مگر ممکن ہے انسانی فطرت ہے تو اس کو بدلتے کتنی دیر لگتی ہے۔ لیکن نجمہ! نجمہ! مجھ سے اچھے ہی لوگ مل سکتے ہیں مگر میرا ایسا نہ ملے گا۔ اے دل سکون پر آ۔ دیکھ! تیری کامیابی اُسی وقت ہوگی جب تو محنت کرے گا۔ اور امتحان میں بھی اچھی طرح سے پاس ہوگا تیرے لیے جو شرط ہے اُس کو پوری کر پھر دیکھا جاویگا۔ ممکن نہیں کہ ہم میں اگر صحیح خواہش ہے تو وہ پوری نہ ہو۔ بس اے دل! تو کتابوں کی طرف رجوع ہو کہ اس کے بعد ایفائے وعدہ کا وقت آتا ہے" پھر کتابوں کی ورق گردانی میں گم ہو جاتا ہے۔

امتحان کا زمانہ آپہونچا۔ صرف دو دن اور باقی ہیں۔ شاہد نے کورس کو مکمل طور سے ختم کر لیا ہے امید ہے کہ فرسٹ سے کم نہ آئے گا۔ مگر اس پر بھی راتوں کی نیند حرام ہو گئی ہے۔ اسی الجھن میں پڑا ہوا ہے کہ نجمہ میری

سب کچھ ہے۔ اس کے ہی لیے میں نے اتنی محنت کی ہے۔ اگر وہ نہ ملی تو یہ سب بیکار ہے۔ یہ لوہڈ کی ڈگریاں کسی کام نہ آویں گی۔ مگر پھر دل سے یوں ہمکلام ہوتا ہے " اے دل تو اتنا کیوں پریشان ہوتا ہے۔ خدا مددگار ہے جائز کام کرنے والے کو خدا دوست رکھتا ہے۔ تیری محبت بے لوث اور پاک ہے۔ اس لیے خدا تجھکو کامیاب کرے گا گھبرا مت آشتی سے کام لے "

خدا معلوم شاہد کی کتنی راتیں اسی قسم کی باتوں میں کٹ جائیں۔ امتحان شروع ہو گیا۔ پرچے یکے بعد دیگرے گزرنے لگے۔ امتحان ختم ہوا۔ شاہد نے پرچے اچھے کئے ہیں۔ بےچینی کے ساتھ نتیجہ کا انتظار کر رہا ہے۔ اس وجہ سے کہ اس پر ہی اسکی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ نجمہ سے اسی وقت شادی ہو سکتی ہے جب شاہد کا نام بھی کامیاب امیدواروں کی فہرست میں ہو اور تب اُس کو حق حاصل ہے کہ وعدہ کو ایفا کی صورت میں دیکھے۔ اسی خیال نے اس کی راتوں کی نیند حرام کر دی۔ رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ جاتی ہے۔ کسی کروٹ چین نہیں آتا اکثر رات کے سناٹے میں آسمان کے ننھے ننھے چمکتے ہوئے ستاروں سے خطاب کرنے لگتا " اے آسمان کے چمکتے ہوئے ستارو! اے اندھیری رات میں مسافروں کے رہبر! اے عاشقوں کے مونسو! تم نے اس دنیا کا نشیب و فراز دیکھا ہے۔ یہاں کے ذرہ ذرہ سے واقف ہو بتاؤ! کیا میں اپنے مقصد میں کامیاب ہونگا؟ کیا میری امید بر آئے گی؟ جواب دو۔ خاموش کیوں ہو؟ حسرت بھری نظروں سے اسکی طرف دیکھتا ہے۔ جب کوئی جواب نہیں دیتے خاموش ہو جاتا۔ آنکھوں سے گرم گرم آنسو ٹپکنے لگتے ہیں مگر پھر دل کو تسلی دیتا ہے۔

اُمید کو قائم رکھو ہو جاؤگے تم کامران! ٭ گرچہ گھٹائیں یاس کی ہوں باعث خوف و خطر

جون کا مہینہ ہے، گرمی شدت سے پڑ رہی ہے ہر طرف اک آگ سی لگی ہوئی ہے۔ جس کو دیکھو گرمی سے پریشان، پسینہ سے شرابور ہے۔ لوگوں کو کسی پہلو چین نہیں آتا۔ شاہد اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا ہے یک بیک اٹھکر کھڑا ہو گیا شیروانی پہنی۔ ٹوپی دی اور سائیکل لے کر بغیر کسی شے کے ایک طرف کو روانہ ہو گیا دوپہر کا وقت جون کا مہینہ، دھوپ کی تیزی۔ گرد و غبار کا اُڑنا۔ اور ادھر شاہد ان سب تکلیفوں کو جھیلتا ہوا ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ سورج کی تیز تیز کرنیں شاہد کے گلابی چہرہ کو جھلسائے دے رہی تھیں۔ مگر خدا معلوم کیوں۔ جوں جوں اسٹیشن کے قریب ہوتا جاتا .... چہرہ کا رنگ اور روشن ہوتا گیا۔ اسٹیشن پر سائیکل سے اترا چہرہ گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا مگر پھر بھی چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر بہت سے ساتھیوں سے ملاقات ہوئی جو ہائی اسکول کے نتیجہ کے اخبار کو دیکھنے آئے تھے۔ شاہد اور اسکے دوستوں میں ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں اتنے میں دوسری ٹرین آتی ہوئی نظر پڑی سب کے دل دھڑکنے لگے کہ دیکھو کیا ہوتا ہے پاس ہوتے ہیں یا فیل کتنے لوگوں کے لیے یہ ٹرین باعث رنج و غم ہو گی اور بہت سے ایسے ہونگے جن کو یہ مژدہ جاں بخش سنائے گی اور وہ

گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح کھل جائیں گے۔

تھوڑی دیر میں گاڑی پلیٹ فارم پر آکر رُکی اور لڑکوں میں ایک بےچینی سی پیدا ہوگئی۔ شاہد نے ایک اخبار خریدا۔ دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اخبار کھولا۔ ورق پر ورق اُلٹتا چلا جاتا ہے مگر اس کو اپنے اسکول کا نام ہی نظر نہیں آتا۔ آخر میں ایک صفحہ پر اس کی نظریں رُک گئیں۔ اسکول کا نام مل گیا۔ گھبراہٹ میں اپنے پیپر صرف رول نمبر پر نظر ڈالی۔ مگر رول نمبر نہ ملا۔ طرح طرح کے خیالات نے دماغ میں چکر لگانا شروع کر دیا۔ کبھی کہتا فیل ہوگیا۔ میری آرزوئیں اب ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئیں۔ نجمہ کو اب کیا منہ دکھاؤں گا۔ بہتر ہے کہ میں جان دیدوں۔ ذلیل ہونے سے کیا فائدہ۔ لوگ کہیں گے کہ بنتے تھے بہت قابل مگر فیل ہوگئے۔ ساری قابلیت ہوا ہوگئی۔ لیکن پھر سوچتا ہے کہ اگر میں نے جان دے دی یا کہیں بھاگ گیا تو نجمہ کی کیا حالت ہوگی۔ بیچاری رو رو کر جان دے دیگی اور پھر والدین کو کتنا قلق ہوگا۔ مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔ اُف یہ کیا ہوگیا! اب کیا کروں۔ کون سا منہ لے کر گھر جاؤں۔ پھر سوچا خیر جو کچھ ہونا تھا ہوا دیکھوں کون کون سے لوگ پاس ہیں۔ اخبار اٹھایا۔ بالکل آخر سے لوگوں کے نام یکے بعد دیگرے دیکھنے لگا۔ لوگ جو تھرڈ کلاس پاس تھے ان کا نام دیکھ چکا پھر سکنڈ پاس ہونے والے لڑکوں کے نام دیکھنے لگا وہ بھی ختم ہوگیا تو فرسٹ پاس ہونے والوں لڑکوں کا نام دیکھا۔ سب نام دیکھ چکا ہے۔ صرف تین چار نام اور اخبار میں ہیں۔ شاہد نے کہا "اب میں ضرور فیل ہوگیا" چہرہ پر اداسی چھاگئی رنج سے دل بیٹھا جاتا تھا ہاتھ سے اخبار چھوٹ گیا مگر کہا "لاؤ اس کو بھی دیکھ لوں" اخبار اٹھایا سب نام پڑھتا گیا۔ سب سے آخر کا جو نام تھا اس پر نگاہیں جم گئیں بار بار پڑھا خوب غور کر کے دیکھا کہ کہیں نظریں دھوکا تو نہیں کھا رہی ہیں۔ جب کامل یقین ہوگیا کہ یہ میرا ہی نام ہے تو خوشی کے مارے اچھل پڑا۔ تیزی کے ساتھ گھر کی طرف چلا۔ لوگ شاہد کا انتظار کر رہے تھے۔ پوچھا "اس دھوپ میں کہاں گئے تھے؟" جواب میں شاہد نے سلام کیا اور اخبار کو پیش کیا۔ اخبار دیکھا گیا۔ شاہد فرسٹ آیا تھا ہر طرف سے مبارکباد کی آوازیں آنے لگیں سب شاہد کی تعریفیں کر رہے تھے۔ مگر وہ کسی دوسرے خیال میں محو تھا۔ چہرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی بات میں الجھا ہوا ہے یہ خوشی کا وقت تھا لیکن شاہد بت کی طرح خموش تھا۔

شام کا وقت تھا سورج کی آخری کرنیں وداع ہو رہی تھیں دن کے ہنگامے سکوت میں بدل رہے تھے رفتہ رفتہ اندھیرا ہونے لگا مکانوں میں لالٹینیں روشن ہوگئیں مگر تھوڑی دیر میں چاند نکل آیا۔ چاندنی چھٹک گئی چاند اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اُس کی روپہلی کرنیں روئے زمین کو سیمیں بنا رہی تھیں۔ ایسے میں انسان ایک تڑپ محسوس کرتا ہے سوتے ہوئے جذبے جاگ اُٹھتے ہیں اور انسان اپنے کو کسی دوسری دنیا میں پاتا ہے ماضی اور حال کی اسے کوئی خبر نہیں رہتی۔ سب باتیں فراموش ہوجاتی ہیں وہ ہوتا ہے اور اس کے رنگین تصورات کی دنیا۔

لیکن شاہد کے دل پر رنج و غم کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ گلاب سے چہرہ پر اداسی چھائی ہوئی ہے کبھی اُٹھتا ہے،

اور کبھی بیٹھتا ہے اور کبھی ٹہلنے لگتا ہے۔ شاہد کسی اہم معاملے میں اُلجھا ہوا ہے۔ اتنے میں آنکھوں سے گرم گرم آنسو ٹپکنے لگے سسکیاں لیتے ہوئے شاہد نے کہا "دھوکا" سخت دھوکا یہ عزیز ہیں۔ اپنے ہوتے ہیں لیکن ان کا یہ برتاؤ! یہ دوست نما دشمن ہیں۔ میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا آخر انھوں نے ایسا کیا ہی کیوں؟ سچ ہے۔

اس بزم میں کوئی بھی شناسا نہیں ہوتا　　　اپنا جسے سمجھے ہیں وہ اپنا نہیں ہوتا

جس کو میں نے اپنا دوست سمجھا تھا وہی آج مخالف ہو رہے ہیں۔ صاف صاف بھی تو کچھ نہیں کہتے ان کی باتوں کا کیونکر یقین آئے۔ کوئی کہتا ہے کہ جب نوکر ہو جاتا تب نجمہ سے شادی کرنا اور کوئی کہتا ہے کہ بی اے پاس کر لو غرض جو ہے وہ اپنی الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا رہا ہے۔

کوئی ہمدرد و مونس نہیں ——— کیا کروں ——— کس سے کہوں ——— یہ لوگ نہیں چاہتے کہ نجمہ کے ساتھ میری شادی ہو۔

نجمہ! نجمہ!! میں اب تجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوتا ہوں۔ کبھی اگر بھولے سے یاد آ جاؤں تو چند آنسو بہا لینا

شاہد نے یہ طے کر لیا کہ کل وہ کوئی نئی چیز دنیا کے سامنے پیش کرے گا۔ ارادہ کا پکا ہے۔ سب انتظام درست کر کے پلنگ پر لیٹ رہا مگر نیند کا پتہ نہیں دماغ میں طرح طرح کے خیالات چکر لگا رہے تھے۔ رات آدھی سے زیادہ ہو چکی ہے۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا ہے۔ یک بیک شاہد کی آنکھ لگ گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک پہاڑی ہے۔ چاروں طرف نالے بہہ رہے ہیں۔ تھوڑے فاصلے پر ایک جھرنا ہے جس کے قریب ہی ایک کٹی نظر آئی شاید کسی پہنچے ہوئے فقیر کی ہے جو دنیا سے الگ رہ کر یاد الٰہی میں مصروف ہے۔ شاہد کا دل بے اختیار کٹی کی طرف کھنچنے لگا۔ ہچکچاتا ہوا کٹی کے قریب آیا مگر اندر جانے میں کوئی قوت مانع ہو رہی ہے۔ وہیں کٹی کے قریب ایک چٹان پر بیٹھ گیا دل مضطرب ہوا ایک ہوک سی جگر میں اُٹھی۔ گھر یاد آیا۔ نجمہ کی بھولی بھالی شکل آنکھوں میں پھرنے لگی۔ بے اختیار رونے لگا۔ ہچکیاں بندھ گئیں کہ اتنے میں سر پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ ایک دردآشنا آواز آئی "کیوں روتا ہے" صبر کر خدا مددگار ہے وہی سب کا بیڑا پار لگاتا ہے شاہد نے گھوم کر دیکھا ایک فرشتہ سیرت بزرگ سر پر ہمدردی سے ہاتھ پھیر رہا ہے۔ شاہد اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اُس فرشتہ سیرت بزرگ نے تسلی اور تشفی دینا شروع کی مگر شاہد کو ان تسلی آمیز باتوں سے کیا ہو سکتا تھا۔ اُس کے سینے میں تو ایک آگ لگی ہوئی تھی۔ مارے صدموں کے دل بیٹھا جاتا تھا۔ تسلی کی باتوں سے تنگ آ کر کہا۔

رہنے دو تسلی تم بس اب دل غمگیں کی　　　کیوں منہ سے لگاتے ہو ٹوٹا ہوا پیمانہ

فقیر نے یہ سنا تھوڑی دیر خاموش کھڑا اُس کی صورت دیکھا کیا۔ پھر کہنے لگا معلوم ہوتا ہے تجھ پر کوئی بہت بڑی مصیبت پڑی ہے۔ خدا تیری مدد کرے لے یہ جنتر ہے اس کو پہن لے۔ خدا چاہے گا تو تیری سب مشکلیں کٹ جائیں گی شاہد کو فقیر نے پہنا دیا۔ اُس کے پہنتے ہی شاہد کو ایک تیز جھٹکا محسوس ہوا اور وہ چٹان سے سو گز کے فاصلے پر ایک نشیب

میں جا گرا۔ جہاں یاقوت و نیلم کے ہزاروں ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ شاہد کی آنکھ کھل گئی اُسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ ابھی اُس کے گلے میں کوئی نوکیلی سی چیز پڑی ہوئی تھی۔ نقیب کی بات کا خیال آیا۔ فوراً اُٹھ بیٹھا۔ سویرا ہو چلا تھا۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ وضو کیا۔ نماز پڑھی اور پھر دیر تک سجدۂ شکر کا لطف لیتا رہا۔ صبح ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ شاہد کی وہ پہلے کی سی افسردگی بھی جاتی رہی۔ آج شاہد کا چہرہ مارے خوشی کے چمک رہا تھا جس سے باتیں کرتا ہنس ہنس کر سب کو ایک حیرت تھی کہ کیا بات ہے کہ شاہد پھولے نہیں سماتا۔ لوگ تعجب کر رہے تھے کہ اتنے میں دوپہر کا وقت آیا لوگ کھانا کھانے بیٹھے مگر شاہد کا پتہ نہ تھا کسی نے خیال نہ کیا۔ کھانا شروع ہو گیا ادھر اُدھر کی باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ اسی دوران میں نجمہ کا بھی ذکر آیا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اب نجمہ کی شادی کر دینا چاہیے مگر کہاں کی جاوے یہ سوال ابھی باقی تھا کہ اتنے میں شاہد آتا ہوا نظر پڑا۔ سب خاموش ہو گئے۔ شاہد نے کھانا کھایا اور دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ شاہد کے چلے جانے کے بعد پھر وہی قصہ چھڑا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ شاہد کے ساتھ ہو اور بہتوں نے اس کی مخالفت کی مگر تھوڑی دیر کے بعد یہ طے ہوا کہ نہیں نجمہ کی شادی شاہد کے ساتھ ضرور ہو گی اور اس خیال نے کچھ ایسا زور پکڑا کہ دو دن کے اندر اندر نجمہ اور شاہد کی شادی ہو گئی اور شاہد نے بھی عزیزوں کے برتاؤ کو بھلانے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب رہا۔

عزیزوں کی بے وفائیوں پر حفیظ　　　صبر کرنا بھی مجھے آ جائے گا

اقوالِ زریں

(۱) ہماری سب سے بڑی خوبی کبھی نہ گرنے میں نہیں بلکہ ہر دفعہ گر جانے کے بعد اٹھنے میں ہے (گولڈ اسمتھ)

(۲) کسی شخص کی عظمت پر حسد نہ کرو کیونکہ اس طرح اپنے کو تم بدترین خلائق ثابت کرتے ہو۔ (ہربرٹ)

(۳) زندگی میں اپنے دوستوں کا محتاج ہونے سے بہتر ہے کہ بعد مرگ اپنے دشمنوں کے لئے مال چھوڑ جاؤ۔ (افلاطون)

"زندگی کی ایک رات"

سید محمد سبطین ایم، اے (غو)
سابق طالب علم شیعہ کالج لکھنؤ

لکھنؤ کے ایک شہری کھیت میں ایک نوجوان کام کر رہا ہے، سر سے پیر تک پسینے میں غرق، لیکن بڑی سرگرمی سے زمین کھودنے میں مشغول ہے، آفتاب کی سنہری شعاعیں اُس پر پڑ رہی ہیں، اُس کا لباس کسی دفتر کے کلرک کا ہے، وہ کسی طرح بھی کسان نہیں معلوم ہوتا، لیکن اُس کی رگوں میں کسانی جوش اور انہاک کام کر رہا ہے، اُس کے ہاتھوں میں پھاوڑا ہے لیکن نرم اور کمزور ہاتھ اس کے عادی نہیں معلوم ہوتے، وہ کام کرتے کرتے بےچینی محسوس کرتا ہے، کچھ رُکتا ہے لیکن پھر اُسی گرمی کے ساتھ کام شروع کر دیتا ہے، کبھی اپنے پھاوڑے کا سہارا لے کر کھڑا ہو جاتا ہے اور زیر لب کچھ بڑبڑاتا ہے، اُس کی نظریں ایک دم کے لیے غروب ہوتے ہوئے سورج کی طرف اُٹھتی ہیں، اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوتی ہے، لیکن پھر وہ سابقہ مستعدی سے کام کرتا ہے، اُس کا انہاک یہ بتاتا ہے کہ شاید اُسے کم از کم ایک ایکڑ زمین آج ہی کھودنی ہے، اُس کے سامنے اُس کے کاشت کیے ہوئے آلو اور دیگر ترکاریوں کے ڈھیر ہیں، وہ خیالات کی رو میں اپنی نوجوان بیوی سے باتیں بھی کرتا ہے جو ان چیزوں کے پکانے میں بڑی سرگرمی دکھاتی ہے

سورج کی آخری کرنیں بھی دُنیا کو خیرباد کہہ چکی ہیں، اندھیرا ہو چکا ہے، وہ اطمینان کی آخری سانس لے کر سیدھا کھڑا ہوتا ہے، پھاوڑا کاندھے پر رکھ کر کچھ دور پر نظر آنے والے چھوٹے سے مکان کی طرف بڑھتا ہے یہی وہ وقت ہے جبکہ اس کو بھوک ستاتی ہے، وہ کھانے کے خیال میں تیزی سے قدم اُٹھائے مکان کی طرف جا رہا ہے، اور اُس کی خیالی دنیا میں ایک پنج سالہ لڑکی ہاتھ پھیلائے اس کی طرف دوڑتی ہے۔

"آہا! میرے اچھے بابا تم آگئے؟ میں بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔"

وہ اُسے دوڑ کر اُٹھا لیتا ہے، اور پیار کرنے لگتا ہے ——— ہاں: وہ اسی طرح دوڑ کر آیا کرے گی، دیکھوں کب وہ وقت آتا ہے؟ میں اُس کا نام "منورما" رکھوں گا، بڑی پیاری بیٹی ہوگی، میری عدم موجودگی میں اپنی ماں کا دل بہلائے گی۔

وہ اسی خیال میں گھر کے اندر داخل ہوتا ہے، موہنی ایک طرف بیٹھی موزے بُن رہی ہے، اُس کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوتی، اُس نے پھاوڑا ایک طرف رکھ دیا، اور موہنی کی طرف بڑھا، لیکن وہ پھر بھی

متوجہ نہیں ہوئی، اُس کی اس بے رخی کا مطلب وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ اُس کے دیر تک غائب رہنے کی وجہ سے ناخوش ہے، سامنے کھانے کی میز پر کھانا چُنا ہوا ہے، لیکن موہنی نے اس چیز کو بھی اسی طرح نظر انداز کر دیا جس طرح اُس نے اپنے شوہر کو کیا تھا، اس کی نرم اور نازک انگلیاں اُسی طرح اپنے کام میں مشغول ہیں، اس کی خاموشی رمیش کو دعوت جنگ دے رہی ہے، اُس کا غصہ بڑھ رہا ہے، اب وہ خانہ جنگی کے لیے بالکل تیار ہو گیا، اُس نے کہا:۔

"کیا میں نے تمہیں بہت دیر تک انتظار کرایا؟"

"بالکل نہیں" اُس نے جواب دیا۔

موہنی نے اپنا کام بند کر دیا اور اُٹھ کر کھانا گرم کرنے لگی، اُس کے انداز سے ناپسندیدگی کا اظہار ہو رہا تھا اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں بجھی بجھی تھیں، اُس نے رفتہ رفتہ کھانا گرم کر کے میز پر رکھا، اس عرصے میں رمیش اُس کی طرف برابر غور سے دیکھتا رہا، وہ سوچ رہا تھا "موہنی لانبی، خوبصورت اور ارادے کی مضبوط عورت ہے، میں کمزور اور ناتوان جسم کا مالک، وہ درحقیقت اب پہلی موہنی نہیں رہی، اُسے کسی شکاری دولتمند کی بیوی ہونا چاہیے تھا، میں اُس کے لائق نہیں ہوں، لیکن میں کیا کروں، وہ خود بھی اُس وقت شادی کے لیے تیار تھی"

موہنی نے یہ محسوس کر کے کہ رمیش اُس کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے مسکرا کر کہا:۔

"کہو کھیت کا کام ٹھیک ہو رہا ہے"

رمیش موہنی کے اس رویّہ پر سخت متعجب ہوا، موہنی کبھی تو اتنی سخت اور کبھی اس قدر نرم و شیریں، اُس کو اپنے سابقہ نظریے پر شبہ ہونے لگا، وہ سوچ رہا تھا "کیا میں نے موہنی کو سمجھنے میں غلطی کی ہے؟ کیا میں نے اُس کو اُسی روز نہیں سمجھا جس روز سے میں نے اُس کو دیکھا تھا"؟ یہ خیال اُس کے دل میں پہلی بار نہیں آیا تھا، لیکن اس نئے جذبے نے پھر اپنا اثر دکھایا، اُس نے اپنے الفاظ پر کہنے سے پہلے افسوس کیا، لیکن پھر بھی کہہ ہی ڈالا۔

"تم کیوں پوچھتی ہو، تمہیں کیا غرض؟"

موہنی نے سر اونچا کیا اور بولی "اچھا نہ سہی، آؤ! اور اب کھانا کھاؤ، ٹھنڈا ہو رہا ہے"

رمیش نے کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ شاید تمہیں میرا کام کرنا پسند نہیں، میں نے تو اس کھیت کو اپنی دلچسپی کے لیے خریدا ہے، اور اس پر روزانہ کئی کئی گھنٹے صرف کرتا ہوں لیکن تمہیں کوئی دلچسپی نہیں، ہاں! یہ میں جانتا ہوں کہ تم کچھ نہیں کر سکتیں تو کیا ہمت افزائی کے

چند کلیے بھی تمہیں نہیں آتے ؟ سچ تو یہ ہے کہ تمہیں یہ کھیتی باڑی کا کاروبار قطعی پسند نہیں "۔

دونوں کھانے کے لیے بیٹھے ، موہنی حسب دستور کھانے کی مختلف چیزیں اور پانی اس کو دیتی رہی ، لیکن رمیش کو آج یہ کچھ بھی اچھا نہیں معلوم ہو رہا تھا ، اُس نے معاملے کو صاف کرنے کی غرض سے کہا :۔

"سُنتی ہو ! مجھے کھیت میں کام کرنے کا شوق ہے ، یہ میرا بہترین مشغلہ ہے ، میں اسے ضرور کروں گا"

" ہاں ! مشغلہ تو بہت اچھا اختیار کیا ، کیا کہنا ! "

"کیوں ؟ اس میں کیا خرابی ہے ؟ "

" پہلے ذرا اپنے ہاتھ پیروں کو دیکھو ، بڑے مضبوط ہیں ، تمہارے آگے تو جفاکش کسان بھی مات ہیں ، ہاں ! کچھ طاقت ہوتی تو یہ بھی ٹھیک تھا ، یوں خواہ مخواہ ہلکان ہونے سے کیا فائدہ "۔

کہنے کو تو موہنی نے کہہ دیا لیکن بعد کو خیال آیا کہ یہ ظاہری الفاظ اُس کے دل کی ترجمانی کر چکے اب کچھ نہیں ہو سکتا ، اُس کے گھر سے دیر تک غائب رہنے سے یا کھیت میں کام کرنے سے وہ ناخوش نہیں تھی ، بلکہ ان تمام مناقشات کی تہ میں کوئی اور چیز تھی ، اُس کے الفاظ نے اُس کے اندرونی جذبات جن کو وہ چھپائے رکھنا چاہتی تھی ، غالباً ظاہر کر دیا ، وہ گھبرائی لیکن پھر دل میں کہا " اونہہ ! کیا کروں کوئی غلط بات تو کہی نہیں "۔ موہنی خیالات کی رو میں دُور نکل گئی ، رمیش سے بھی دور جو ایک معمولی کلرک تھا ، جس کا مطمح نظر صرف اپنے ہاتھوں سے ترکاریاں پیدا کرنا تھا ۔

رمیش نے اُس کے جذبات کو اُس کی آنکھوں سے معلوم کر لیا ، اُسے تکلیف ہوئی ، اُسے اپنا نحیف و لاغر جسم وزنی اور گراں معلوم ہونے لگا ، لیکن کوئی جواب اس کی سمجھ میں نہ آیا ۔

دونوں نے خاموشی سے اُس اصلیت کو بھلانے کی کوشش کی جو موہنی کے غیر ارادی جملے نے ان کے پیش نظر کر دی تھی ۔ رمیش نے آخر کار موہنی کے الفاظ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا :۔

" مجھے یہ کام بہت پسند ہے ، تندرستی بھی اچھی رہے گی ، ٹھنڈی ہوا اور محنت بڑی مفید چیزیں ہیں ، دن بھر دفتر میں کام کرنے کے بعد اس سے بہتر مشغلہ میری سمجھ میں نہیں آتا "۔

" ہاں مجھے یقین ہے کہ ضرور یہ تمہارے لیے مفید ہے "۔ موہنی نے اپنے اُس اعتراض کی تلافی کرنے کی غرض سے بہت ہی شیریں لہجے میں کہا " تم ان دنوں کچھ تندرست نظر آتے ہو ، بڑا اچھا مشغلہ ہے "۔

رمیش نے موہنی کے اس لہجے پر کچھ مطمئن ہو کر کہا " لیکن تمہیں ضرور اکیلے بُرا معلوم ہوتا ہوگا ، مجھے اس کا احساس ہے ، کاش میری غیر حاضری میں تمہارا دل بہلانے کے لیے کوئی دوسرا ہوتا "۔

موہنی نے حیرت سے کہا " اس سے تمہارا کیا مطلب ہے ؟ "

"نہیں نہیں" اُس نے ہنستے ہوئے کہا "میرا مطلب یہ ہے ——— ابھی جب میں کھیت سے آرہا تھا تو میں نے خیال کیا کہ کیا اچھا ہوتا اگر ہماری کوئی اولاد ہوتی"

موہنی کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ اُس نے کہا "بار بار تم ایسی ہی باتیں کرتے ہو۔ میں اب سُننا نہیں چاہتی، جب دیکھو یہی تذکرہ — اولاد — اولاد — لیکن ——"

"کیا؟ — کیا مطلب؟" رمیش کا غصہ تیز ہو رہا تھا۔ اُس نے کہا "مجھے ضرورت ہے۔ میں اولاد چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ لڑکی ہو تاکہ تمہارا دل بہلا سکے" وہ غصہ سے سُرخ ہو رہا تھا، کرسی پیچھے ڈھکیل کر وہ کھڑا ہوگیا، اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

موہنی نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آخر تمہارا کیا منشا ہے؟ میرے لیے اب تمہاری باتیں ناقابل برداشت ہوتی جاتی ہیں"

رمیش اوّل تو یوں ہی غصہ سے دیوانہ ہو رہا تھا یہ سُن کر اور آپے سے باہر ہوگیا۔ اُس نے کہا کہ "شاید تم یہ بھول گئی ہو کہ پتی کی اطاعت کرنا ہر استری کا دھرم ہے"

"میں یہ عقل بھری باتیں سُننا گوارا نہیں کرسکتی"

"تو کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں تمہیں چھوڑ دوں"؟

موہنی خاموش ہو رہی، اس کی خاموشی نے رمیش کے غصے کو اور تیز کر دیا، اُس نے کہا "شاید تمہیں اس کا رنج بھی نہ ہو، تم یہی چاہتی ہو"

موہنی نے خلاف اُمید جواب دیا۔ "جیسی تمہاری خوشی"

اِس جملے نے دونوں کو چونکا دیا، وہ غصے کی رَو میں اُس جگہ پہونچ گئے تھے جہاں وہ اُسکی مدد کے بغیر شاید کبھی نہیں پہونچ سکتے تھے، اُنھیں اپنے کانوں پر شبہ ہوا، یہ جملہ کچھ نیا اور بُرا معلوم ہوا، لیکن تھا یہ سب کچھ حقیقت پر مبنی، دونوں نے خود ہی یہ کہا بھی تھا، لہٰذا شبہ کی گنجائش نہ تھی۔

گھڑی نے گیارہ بجائے، موہنی اُٹھی اور سونے کے کمرے کی طرف چلی، رمیش بھی پیچھے پیچھے چلا، وہ خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا، اور اس واقعہ کی یاد کو اُس نے بھلانے کی غرض سے کہا "میرا خیال ہے"

"کیا خیال ہے آپ کا" موہنی نے ترشروئی سے کہا۔

"کچھ نہیں یونہی" اُس نے آگے کچھ نہیں کہا کہ شاید موہنی کو اور گراں گزرے۔ رمیش نے کمرے کا لیمپ روشن کیا، بستر ٹھیک کیا اور کھڑکی کے پاس کھڑا ہوگیا۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی، گھاس کا میدان سامنے تھا جہاں وہ بچپن میں کھیلا کرتا تھا، عہد طفلی و نوجوانی کی تمام یاد تازہ ہو گئی، لیکن اس وقت اس دلچسپ ماضی میں بھی تلخی تھی، وہ اس کی یاد سے اور زیادہ رنجیدہ ہوا، پھر موہنی کی پہلی ملاقات کا منظر بھی سامنے آ گیا، لیکن بجائے خوشی کے اُس کے جذبات کو اذیتیں لگی، نہ معلوم کیا سوچ کر اُس نے کہا:—

"کیا کھڑکیاں کھلی رہنے دوں؟"

"میں نہیں جانتی،" موہنی نے چادر کے اندر منہ چھپاتے ہوئے کہا

رمیش نے دونوں کھڑکیاں کھلی رہنے دیں، لیکن وہیں کھڑا رہا، میدان تاریک نظر آ رہا تھا، چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی، اگر وہ چاہتا تو کھڑکی سے کھیتوں میں چلا جاتا، لیکن پھر کچھ خیال کر کے اپنے پلنگ کی طرف بڑھا، اُس کا پیر کسی چیز سے ٹکرایا۔

"اچھا تو تم نے چوہے دان پھر لگا رکھا ہے۔"

"ہاں" موہنی نے کہا "میں ان چوہوں سے دوستی پسند نہیں کر سکتی۔"

"لیکن یہ تو میدانی چوہے ہیں، آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، کچھ ضرر نہیں پہونچاتے۔"

"کچھ ہوں، فرشتے سہی، میں پسند نہیں کرتی۔"

"ہوں، تو فرشتوں کیلیے یہ جال کافی نہیں ہے، ان کیلیے تو بڑا پنجرہ رکھا ہوتا۔"

موہنی نے اُس کے اس طنز کا جواب خاموشی سے دیا۔ رمیش اور موہنی دونوں جدائی کیلیے تیار تھے دونوں یہ جانتے تھے کہ انھیں علیحدہ ہونے ہی میں چین مل سکتا ہے، لیکن جب تک علیحدگی نہ ہو، یہ عرصہ بار تھا، اور جدائی کا خیال گراں ہو رہا تھا، لیکن موہنی اس تلخ حقیقت کو خاموشی سے برداشت کرنا چاہتی تھی، وہ ان معمولی باتوں میں اس ماحول کو خراب نہیں کرنا چاہتی تھی، جو انھیں آزاد کر سکتا تھا، لیکن رمیش مختلف کوششوں سے اس موجودہ ماحول کو بدلنا چاہتا تھا گو کہ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ سہل اور عمدہ طریقہ وہی ہے جس کی کوشش موہنی کر رہی تھی۔

موہنی سو گئی، لیکن رمیش کو نیند نہ آئی، وہ پڑا کروٹیں بدلتا رہا، وہ سوچ رہا تھا "کیا علیحدگی ضروری ہے، ابھی تو میں کسی اور لڑکی سے شادی بھی کرنا نہیں چاہتا، اور نہ کوئی لڑکی میری نظروں میں ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ علیحدگی اختیار کرنا کوئی معمولی مسئلہ نہیں کہ انکم اس پر غور کرنے کے لیے وقت چاہیئے ابھی جلدی ہی کیا ہے، یہ معاملہ تو ایسا ہے کہ اطمینان سے طے ہوتا رہے گا، انھیں خیالات میں وہ بھی سو گیا۔

کسی زوردار آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی، وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا، موہنی نے کہا "یہ کس چیز کی آواز

ں، ذرا دیکھو! مجھے ڈر لگتا ہے، تمہارے سرہانے لیمپ ہوگا، پہلے اُس کو جلاؤ، دیکھو اندھیرے میں ہرگز نہ اُٹھنا
ری کرو، میں ڈر کے مارے مری جاتی ہوں"۔

رمیش نے جلدی سے لیمپ روشن کیا، اُٹھ کر دیکھا تو ایک بڑا چوہا پنجرے میں پھنسا ہوا تھا، اور وہ چوہے دان
ے بند ہونے کی آواز تھی۔

اُس نے چوہے دان اُٹھا کر چوہے کو کتے کے سامنے چھوڑ دینے کا ارادہ کیا (پھر کچھ سوچ کر) "نہیں!
ا خوبصورت چوہا ہے، میں اسے آزاد کیے دیتا ہوں، کہو! تمہاری کیا رائے ہے؟"

یہ کہکر اُس نے چوہے کو باہر چھوڑ دیا، ہوا بہت ٹھنڈی چلنے لگی تھی، اُس نے کھڑکی بند کر دی، اور
پلنگ کی طرف چلا، موہنی جو اُس کے قریب والے پلنگ پر اپنا بستر لا چکی تھی بولی:-

"کہیں سردی نہ لگ جائے، تم یونہی ہوا میں گھومنے لگتے ہو، کمبل اوڑھ لو"۔

رمیش لحاف میں گھس گیا، اور اب دونوں نے اتنی دیر کی جنگ کے بعد خوشی خوشی باتیں کرنا شروع کیں
موہنی کہنے لگی، "مجھے وہاں زمین پر سوتے ہوئے ڈر لگتا ہے، اب میں یہیں سوؤنگی، تم نے بہت اچھا کیا کہ
اُس بیچارے کو آزاد کر دیا، نہ معلوم اُس پر کیا گزر رہی ہوگی"۔

دونوں مسکرائے لیکن پھر خاموش ہوگئے، موجودہ باتوں نے اُن کے جھگڑے کو ختم کر دیا تھا
اور علیحدگی کا سوال التوا میں پڑ گیا تھا، شاید وہ چوہے کی آزادی اور اپنی گرفتاری کے مسئلہ پر غور
کر رہے تھے۔

مجاز

علی عابد درجہ نہم

جتنی ہیں چیزیں اے ہنر لیکے زمیں سے چرخ تک
سب ہیں نظر میں بیقرار، دل جو نہیں قرار میں

رقص و سرود کے جلسے، شراب و کباب کے چرچے، ہمارے قہقہے اور عنادل کے چہچہے اسی وقت تک نشاط انگیز ہیں جبتک دل خوش ہے، لیکن دل کے رنجیدہ ہونے پر یہ تمام اسباب بھی موجب رنج و الم ہوجاتے ہیں پھر بھی دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اُمید کی بدولت خوشی منا رہے ہیں، رتن ناتھ اسمیں سے ایک تھے، بھدّی صورت مگر عمدہ سیرت، آنکھیں چھوٹی مگر دل کشادہ، زنہار مگر رحیم، حسن دوست مگر پاکباز۔ غرضکہ وہ قدرت کی متضاد صفات کے انوکھے گلدستے تھے۔

وہ روز منھ اندھیرے اُٹھتے، ٹھاکر جی کی پوجا کرتے اور باقی تمام دن دوست احباب میں گزار دیتے، اُن کی عبادت گو اتنی ہی ہوتی جتنی ایک فقیر کی خیرات، تو بھی لوگ ان کو بڑا عبادت گزار سمجھتے تھے، ٹھاکر جی سے انکو کتنی عقیدت تھی اس سے لوگوں کو کوئی بحث نہ تھی۔ اب آپ اس کو قوت ارادی کا صدقہ کہیئے یا اطاعت گذاری کا ثمرہ کہ آج انکو ایک لڑکے کا باپ ہونا نصیب ہوا۔ آج وہ بہت خوش تھے اور ذرا ذرا سی باتوں پر کھلے پڑتے تھے۔ دل کے ساکن تالاب میں مسرت کا کنول پھوٹ چکا تھا اور رتن ناتھ اپنے حسین بچے پھول چند کی خبرگیری میں مصروف تھے۔

پھول چند بھی اُنسے بہت مانوس تھا اور اب تھوڑا بہت چل پھر بھی سکتا تھا۔ رتن ناتھ اسکو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے اور اسکا دل بہلانے کی خاطر مٹھائیاں اور کھلونے مہیا رکھتے تھے، مگر ناسمجھ بچہ ان چیزوں کی طرف دیکھتا بھی نہ تھا۔ صحن کے وسط میں ایک پختہ چبوترہ تھا اور اسکے اردگرد خوشنما کیاریوں میں سرخ اور سفید گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے، چھوٹا بچہ انکو ایک دلچسپ کھلونا سمجھ کر لپکتا اور انکو توڑ کر گھنٹوں کھیلا کرتا۔ جاپان کے کھلونے، لندن کے بسکٹ، لکھنؤ کی مٹھیاں اور رتن ناتھ کی پیچ دار باتیں بھی اسکو کھیل سے نہ اٹھا سکتیں، معلوم نہیں ہمنامی یا پھولوں کی خوشنمائی کی وجہ سے پھول چند ان پر اس قدر گرویدہ تھا۔ کاش رتن ناتھ بچہ کو یہی سمجھ کر روکتے کہ پھولوں سے کھیلنے میں کانٹوں سے بھی دوچار ہونا پڑے گا۔ مگر بچہ کی خوشی سے خوش ہونے والے رتن ناتھ کو اتنا ہوش کہاں؟

زمانے نے گردش کی، اب رتن ناتھ کی جگہ پھول چند کا دور دورہ تھا، زمینداری، جائداد اور تمام روپیہ پیسہ کا انتظام اس کے ہاتھوں تھا۔ شاید یہ اس کی حسن انتظامی ہی کا نتیجہ تھا کہ سب اس کو پیار کرتے تھے اور کیوں نہ کرتے جبکہ حسن سیرت کے ساتھ حسن صورت بھی ہو، واقعی پھول چند ایک پھول تھا، پھول ہی کی طرح نازک، پھول ہی کی طرح صاف دل اور پھول ہی کی طرح کھلا ہوا۔ مگر زمانے کے متلاطم سمندر میں ہچکولے کھا رہا تھا۔

(۲)

حسن کی دلکشی مسلم! پھر اگر پھول چند کسی شمع کا پروانہ ہوا تو کیا نئی بات کی۔ اس کے پہلو میں دل تھا اور دل میں امنگیں، پھر جوانی کا نشہ، اگر لیلاوتی کو اس نے اپنی قسمت کا تارا سمجھا تو کیا برا سمجھا۔ لیلاوتی ایک ہندوستانی لڑکی تھی۔ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئی اور یہیں پرورش پائی مگر مغربی تہذیب کے زیر اثر وہ اس وقت ایک ایکٹریس تھی۔ جتنی زیادہ حسین اتنی ہی زیادہ کامیاب۔ گو شرم و حیا کا اعلیٰ جوہر جو ہر ہندوستانی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے اس سے بالکل مفقود نہ ہوا تھا تو بھی ایک حد تک زائل ضرور ہو چکا تھا۔

پھول چند سے گواہی تک نظروں کے پیام و سلام کے علاوہ زبانی بات چیت کی نوبت نہ آئی تھی مگر قسمت جو اچھے وقتوں میں الگ نہیں ہوتی برے وقتوں میں کیوں ساتھ چھوڑے۔ چنانچہ اسی سال میں بات چیت ہی نہیں بلکہ ہنسی مذاق تک بھی نوبت پہونچ گئی۔ لیلاوتی جب سے دنیائے فلم میں آئی تھی ایسے کھیل نہ صرف دیکھ ہی چکی تھی بلکہ انمیں نہایت خوبی سے پارٹ بھی ادا کر چکی تھی لہذا اسکے لئے تو یہ کوئی خاص بات نہ تھی مگر پھول چند کے لئے بہت اہم معاملہ تھا، اب ملاقاتوں کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ رات دن وہ تھا اور لیلاوتی اور شہر کے تفریحی مقامات۔ لیلاوتی اسپر مہربان تھی جو پھول چند کے خوش ہونے کے لئے بہت کافی تھا۔

محبت ابھی ابتدائی منزل میں تھی اور پھول چند ذرا سی کوشش سے بھی جادۂ محبت منحرف ہو سکتا تھا مگر اس کو کیا پرواہ۔ جوانی ہی کا نشہ کیا تھوڑا تھا جو دولت اور محبت کے نشے نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ کاش وہ اسوقت اپنے مستقبل پر غور کرتا اور سنبھلنے کی کوشش کرتا مگر اس کی آنکھوں پر تو کچھ ایسے پردے پڑ گئے تھے کہ اس کو کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ بہرحال آئندہ کا خیال مسرت کی خوش آیند گھڑیوں میں کسکو نہ تھا۔

ایک روز لیلاوتی پھول چند سے خفا ہو گئی اور اسکو ایک نوکر کی طرح گھڑکی دی۔ پھول چند کے لئے لیلاوتی کا بگڑنا بننے سے کم خوبصورت نہ تھا۔ مسرت کی گھڑیاں بہت جلد ختم ہو گئیں۔ ایک سال کا ختم ہونا تھا کہ پھول چند کی آنکھیں کھل گئیں، اس کی تمام دولت محبت کے ثبوت میں لیلاوتی کے ہاتھ میں تھی، اور پھول چند اب ایک مہمان کی حیثیت سے ایک دوست کے یہاں رہنے لگا تھا۔ ملاقاتوں کا دائرہ جس تیزی سے بڑھا تھا اتنی ہی تیزی کے ساتھ گھٹنا شروع ہوا۔ روزانہ ملاقاتوں سے ہفتہ وار اور ہفتہ وار سے مہینہ وار تک نوبت پہونچ گئی تھی

کئی دفعہ اس نے ملاقاتیں بڑھانے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔

کہا جاتا ہے کہ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے والا اگر دفعتاً غریبی کے بھنور میں پھنس جائے تو اسکو زندگی تنگ ہو جاتی ہے مگر پھول چند نے اس کو غلط دکھایا۔ دوست کے گھر میں وہ نہایت تنگی سے بسر کر رہا تھا حالانکہ دوست اسکا بے حد خیال رکھتا تھا مگر گھر کی آسائش کہاں۔ اس کے دوست کو پھول چند کا حال اچھی طرح معلوم تھا۔ اس نے کوشش کی کہ اسکو اب بھی راہ راست پر لگائے، اس نے تمام چیزیں مہیا کر دیں تاکہ پھول چند کا غم غلط ہو۔ مگر پھول چند نے کوئی توجہ نہ کی۔ کئی دفعہ دوست نے اسکو سمجھانے کی کوشش ناکام بھی کی مگر پھول چند اب اسکو بھولنا نہ چاہتا تھا، وہ ہر وقت چپ رہتا تھا۔ اسکی بذلہ سنجی، خوش گفتاری اور حاضر جوابی غائب ہو چکی تھی اور اب وہ ہمیشہ خاموش رہتا تھا۔ لیلا وتی کو بھی پھول چند کے تغیر کا حال معلوم تھا، مگر اسکو کوئی پرواہ نہ تھی، وہ آجکل نئے دوستوں میں مصروف تھی۔ شاید پھول چند اب اس لائق نہ رہا تھا کہ اسکی خدمت کر سکے۔ جدائی کا طولانی وقفہ بھی دھیرے دھیرے گذر رہا تھا اور زمانہ کوشش کر رہا تھا کہ پھول چند رفتہ رفتہ ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر ایک مدت گزر چکنے پر بھی پھول چند کی خاموشی میں کوئی تغیر نہ تھا، دوست، احباب، زمانہ یہانتک کہ اسکی برگشتہ قسمت بھی اس کو ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ایک نہیں تھا تو دنیا سے بے نیاز تھا، بغیر کچھ کئے ہوئے ترحم آمیز نظروں سے اسکو تک رہا تھا۔ صبر کی بھی حد ہوتی ہے اور ضبط کی انتہا۔ پھول چند کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا لہذا وہ زبوں حالت، ڈگمگاتے ہوئے قدم اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ لیلا وتی کے پاس اس وقت پہونچا جب وہ موٹر پر سوار ہونے جا رہی تھی۔ کچھ نئے اور کچھ پرانے دوست اس کے گرد تھے اور ہنسی مذاق ہو رہا تھا پھول چند کو گذشتہ لطف یاد آگئے اور وہ ان میں ڈوب گیا، مگر صرف ایک لمحہ کے لئے کیونکہ اسکو پتہ چلا کہ لیلا وتی اس کو دیکھ رہی ہے۔ اُسنے نظریں اٹھائیں، ایک لمحہ کے لئے اس نے لیلا وتی کو اور لیلا وتی نے اسکو دیکھا مگر اتنی ہی دیر میں لوگوں کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ پھول چند کو کچھ پرواہ نہ تھی شاید وہ کچھ آگے بڑھ گیا اور کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر اس کے ہونٹ ہلتے رہ گئے اور وہ کچھ کہہ نہ پایا کیونکہ اس نے دیکھا کہ لیلا وتی گھبرا کے پیچھے ہٹی مگر فوراً ہی وہ سنبھل گئی شاید وہ زیر لب کچھ مسکرائی یا کچھ کہا ہو مگر اتنا تو ضرور ہے کہ وہ بالکل ایک ایکٹرس کی طرح آگے بڑھی جلدی سے منی بیگ کھولا اور ایک اکنی نکالی پھر اس کو لیکر مسکرائی۔ ایک دفعہ اس نے اکنی کو دیکھا اور پھر فوراً ہی پھول چند کو۔ اور پھر وہ اکنی پھول چند کی طرف پھینک دی اور کہا "جاؤ آگے بڑھو سائیں بابا۔" پھول چند کو ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے اسکو ایکدم خواب سے جھنجھوڑ دیا ہے اس نے دوڑ کر اکنی اٹھالی، جیسے وہ کوئی قیمتی چیز ہو، ایکدفعہ لیلا وتی کو دیکھا آہ! اس کی نظر میں کتنا درد تھا۔ مگر درد سے ڈوبی ہوئی اور متلاشی نظروں نے یہ معلوم کر لیا کہ اُدھر کی نظریں بھی بے چین پھول چند کو پتہ چلا کہ جیسے لیلا وتی کے خاموش لب اُسے جانے کو کہہ رہے ہیں۔ پھول چند یہ دیکھ کر پلٹا۔ اُسکا پلٹنا تھا کہ

لیلاوتی نے بھی موٹر میں قدم رکھا اور موٹر چل دی۔ پھول چند نے آخری اور الوداعی نظریں موٹر پر ڈالیں اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دو بوندیں گر پڑیں۔ مگر اُسنے باقی آنسوؤں کو ضبط کر لیا اور چپ کھڑا ہوا، اسوقت اسکا عجب حال تھا مسرت اور غم دونوں اسکو بے چین کر رہے تھے، اسکا حال اس باپ کا سا تھا جس کے جوان بیٹے کے مرنے پر ایک لاکھ کی لاٹری نکل آئی ہو۔ راستہ بھر پھول چند کو معلوم ہوا کہ جیسے اُس کے کانوں میں کوئی کہہ رہا ہو کہ "اب تم لیلاوتی سے نہ مل سکوگے۔"

دنیا کو کچھ خبر نہیں کہ وہ کہاں گیا، شاید وہ کسی جنگل میں چلا گیا ہو مگر چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہوا ہو یہ ضرور ہے کہ وہ بڑا خوش قسمت تھا۔ آخری وقت بغیر [illegible] اپنی پیش کئے ہوئے اگر اس کو ایک لاکھ کی مل گئی تو معمولی بات نہ تھی۔۔۔

۔۔۔ کچھ دنوں بعد اس بے انت دنیا کی فضا میں ایک ایسی آواز گونج رہی تھی جو سوز، درد اور اثر سے ڈوبی ہوئی تھی اور جس کو کسی مرنے والے کے جاتے ہوئے لب انتہائی مسرت سے ادا کر رہے تھے۔ شاید اُس آواز کا ماحصل یہ ہو ؎

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

قصیدہ در مدح صاحب العصر و الزمان

از سید بہادر حسین دلکش زبسٹ ایر سائنس

تمہارے عشق میں اب مبتلا سارا زمانا ہے ۔ اٹھا کر پردہ غیبت چلے آؤ جو آنا ہے
خدا کے واسطے جلدی اٹھا دو پردہ غیبت ۔ تمہاری دید کا مشتاق اب سارا زمانا ہے
مٹا دے گا جہاں سے مذہب باطل کی ہستی کو ۔ ظہور حجت حق میں بہت تھوڑا زمانا ہے
تمہارے حسن رخ سے یوں منور باغ دنیا ہے ۔ کہ جو ذرہ چمن کا ہے وہ تابندہ ستارا ہے
چمن میں عندلیبان چمن یوں چہچہاتے ہیں ۔ کہ جیسے باغ عالم میں کوئی گل آنیوالا ہے
جناب نرجس خاتوں کی آغوش تمنا میں ۔ مہ کامل ہے یا اک صبح محشر کا ستارا ہے
سحر تک شام سے آنکھوں سے اشک خوں بہاتا ہوں ۔ تمہارے عشق کا قصہ مجھے رنگیں بنانا ہے
عریضہ دے کے دریا پر ادب سے چپ کھڑا ہوں یوں ۔ کہ جیسے سامنے ہیں وہ فقط پانی کا پردا ہے

رہو ایمان پر قایم وہ اکدن آئیں گے دلکش
فقط حکم خدا کی دیر ہے ان کو تو آنا ہے

بیٹے کی لاش پر ماں کے بین

از سید نجم الحسن شمیم

ماں کہتی تھی رو رو کے مری آنکھوں کے تارے پیارے علی اکبر ۔ افسوس کہ دنیا سے پرارماں ہی سدھارے پیارے علی اکبر
تسلیم دم مرگ مجھے کر کے گئے ہو صدقے گئی تم پر ۔ کیا تم کو دعا دے کے یہ ناشاد پکارے پیارے علی اکبر
ہو جاتی تھی اکثر دل بیتاب کو ڈھارس اس دشت بلا میں ۔ جب دیکھتی تھی میں رخ روشن کو تمہارے پیارے علی اکبر
کی خوب لعینوں سے دغا راہ خدا میں قربان ہو مادر ۔ اماں ترے بکھرے ہوئے گیسو کو سنوارے پیارے علی اکبر
میداں میں تری لاش ہے بے والی و وارث نہیں جاتی ہوں نکلے ۔ اک شمع جلا پائی نہ مرقد پہ تمہارے پیارے علی اکبر
دیکھو تو ذرا ناموں ہمشیر دل افگار روتی ہے وہ ہر دم ۔ لے آؤ بھی اس بیکس ناشاد کو بارے پیارے علی اکبر
مجبور ہوں اتنی کہ کفن دے نہیں سکتی ہے عالم غربت ۔ ہونا نہ خفا ماں سے مرے راج دلارے پیارے علی اکبر
رو رو کے شمیم آہ جو غش کر گئی بانو کہتی تھی یہ ہر دم ۔ پیارے مرے اکبر مرے اکبر مرے پیارے پیارے علی اکبر

کیا سمجھتے تھے کہ دنیا بے خبر ہو جائیگی

از جناب سید سرفراز حسین صاحب خبیر لکھنوی

ڈوبنے کی میرے ساحل پر خبر ہو جائے گی
ہر زبانِ موج اک پیغامبر ہو جائے گی

میری آہِ بے اثر جب با اثر ہو جائے گی
چاک ہوگا پردۂ شب خود سحر ہو جائے گی

زد پہ جب دوزخ کی رکھیں گے مجھے میرے گناہ
رحمتِ معبود خود سینہ سپر ہو جائے گی

ہوگی ظاہر مجھ سے بعدِ مرگ بھی شانِ کمال
خاک میری سُرمۂ اہلِ نظر ہو جائے گی

حشر میں کیا اُن پہ اپنے خون کا دعویٰ کروں
میرا شاہد کون ہے دنیا اُدھر ہو جائے گی

سامنے سب کے مرا دل چاک کیوں کرتے ہیں آپ
میری اُمیدوں کی کثرت پر نظر ہو جائے گی

ختم پر ہے شامِ غم جینے کے قائل تھے نہ ہم
اے فلک کیا موت سے پہلے سحر ہو جائے گی

جان دینا سہل ہے مشکل ہے جینا ہجر میں
زندگی پھر بھی کسی صورت بسر ہو جائے گی

کیسی پیری دل ہوا قبلِ جوانی ہی ضعیف
کیا خبر تھی شام سے پہلے سحر ہو جائے گی

شامِ فرقت کو گزارا شامِ تربت اور ہے
وہ مہم سر ہو چکی ہے یہ بھی سر ہو جائے گی

دفن کر کے ہم کو بھولا ہے زمانا اے خبیر
کیا سمجھتے تھے کہ دنیا بے خبر ہو جائے گی

برسات میں ساغر

جناب فضل نقوی (مدیر تطارہ)

بھیس میں باغ کے روپوش ہے سارا جنگل
منتشر ہوتے ہوئے درد میں ڈوبے نالے
ابر ہر سمت سے اس طرح چمک کر اُٹھے
برق کیا دیکھتی ہے اپنی جبیں سائی میں
رعد کے ساتھ ملا دیتا ہے یوں ساز کوئی
اس تصور کے تلاطم میں یہ دیکھا منظر،

اُف ! یہ برسات، سچکتے ہوئے کالے بادل
اُڑتے پھرتے ہیں ہواؤں میں روپہلی چھالے
جس طرح کوئی گھنے بال جھٹک کر اُٹھے
کتنی طاقت ہے چمکتی ہوئی انگڑائی میں
جس طرح بھول کے دے دیتا ہو آواز کوئی
مسکراتا ہے کوئی ہاتھ پہ رکھے ساغر

کیا یہی وقت ہے واعظ ترے بہلانے کا ؟
رنگ تو دیکھ چھلکتے ہوئے پیمانے کا

تاثراتِ اسدؔ

اسد (انصاری)

بارہا اُٹھ آئے نادم ہو کے جس محفل سے ہم
جا رہے ہیں پھر وہیں مجبور ہو کر دل سے ہم

دیکھ ! او محوِ تغافل دل کی اُمیدیں نہ توڑ
آستاں تک تیرے آئے ہیں بڑی مشکل سے ہم

آئے ہیں سارے جہاں کی ٹھوکریں کھا کر یہاں
اب کہاں جائیں بتا ، اُٹھ کر تری محفل سے ہم

روز اُٹھتے ہیں نئے طوفان بحرِ عشق میں
روز لوٹ آتے ہیں کھا کر ٹکریں ساحل سے ہم

دلے ناکامی ! کہ تھک کر عاشقی کی راہ میں
راہ گھر کی پوچھتے ہیں رہبرِ منزل سے ہم

عشق میں جینے کو تھوڑا بھی سہارا ہے بہت
ہمدمو ! کیوں باز آئیں سعیِ لاحاصل سے ہم

زندگی بھر خوب ہی دل کھول کر شکوے کیے
اب پشیماں ہو رہے ہیں حشر میں قاتل سے ہم

اِک نئی منزل وہیں بنتی ہے راہِ عشق میں
دم جہاں لیتے ہیں تھک کر دُور ہی منزل سے ہم

عشق میں ناگفتنی ہے اے اسدؔ رودادِ غم
کیا کہیں سہتے ہیں کیوں آٹھوں پہر بیدل سے ہم

افکارِ جمیل

ضا جمیل
حب ایڈیٹر

ابتدا تھی عشق کی میں واقفِ منزل نہ تھا ٹھوکریں کھاتا رہا قابو میں میرا دل نہ تھا
ذبح کر کے دیکھ تو لیتے شہیدِ ناز کو کیا مرے جاں رقصِ بسمل دید کے قابل نہ تھا
پیشِ داورِ حشر میں جب ہوگی اُس سے بازپرس میں قسم کھا کر کہوں گا یہ مرا قاتل نہ تھا
ابتدا میں وہ محبت انتہا میں یہ ستم میرا دل لینے سے پہلے آپکا یہ دل نہ تھا
اب میں خود گم کردہ منزل بن گیا ہوں اے جمیل
ذرہ ذرہ چھان ڈالا کوئی میرا دل نہ تھا

حدیں تھیں ختم جفا کی میں آہ کر نہ سکا وفا پرست تھا لیکن نباہ کر نہ سکا
حریمِ ناز میں بھی تھا خیالِ راز و نیاز نگاہِ شوق سوئے جلوہ گاہ کر نہ سکا
نہ آہ کی نہ مری آنکھ سے گرا آنسو کسی کو عشق کا اپنے گواہ کر نہ سکا
کچھ ایسا جذبِ محبت میں بیقرار رہا کھنچا جو تیر جگر سے میں آہ کر نہ سکا
جمیل آئے دمِ نزع وہ عیادت کو
میں سب کے سامنے اُن پر نگاہ کر نہ سکا

تضمین بر غزل مرزا غالب

اکبر حسن صدیقی "اکبرؔ"
(بدایونی)

کوئی آسان ہے ہر کام کا آساں ہونا   ہر گلِ تازہ کو فردوس بداماں ہونا
ہر تجلّی کو فروغِ رُخِ جاناں ہونا   بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

اب نہ ہم وہ ہیں، نہ وہ شورشِ سودائے نشاط   اب نہ وہ دل ہے، نہ وہ حسرتِ شب ہائے نشاط
لے مُبارک ہو تجھے اے چمن آرائے نشاط   لے گئے خاک میں ہم داغ تمنّائے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

جیتے جی میرے نہ کی اُس نے خدا سے توبہ   اب ہوئی توبہ تو ہو میری بلا سے توبہ
کیا عداوت تھی اُسے اہلِ وفا سے توبہ   کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زُود پشیماں کا پشیماں ہونا

کم نہیں کوئی بھی ہنگامۂ عشرت غالبؔ   پھر جسے تیری محبت سے ہو نسبت غالبؔ
وحشت اور پھر دلِ شوریدہ کی وحشت غالبؔ   حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

غزل

محمد ولی الحق انصاری
درجۂ دوازدہم (بی)

حاصل ہوا جہاں میں غمِ جاوداں مجھے — لائی مری حیات کہاں سے کہاں مجھے
ہاں ہاں! خوشی سے پھونک دے برقِ تپاں مجھے — ہے جاں سے بھی عزیز مرا آشیاں مجھے
آئی نظر حقیقتِ کون و مکاں مجھے — پہونچا دیا یہ ساغرِ مے نے کہاں مجھے
سمجھے نہ کوئی اہلِ سفر ناتواں مجھے — چھوڑے گا خود نہ تا بعدم کارواں مجھے
سودائے عاشقی تو نہیں کچھ گراں مجھے — ہے پیش کرنا جس کے لیے نقدِ جاں مجھے
دے جلد جام لے مرے پیرِ مغاں مجھے — ہے طاقت سکون و تحمل کہاں مجھے
ہمدم تسلیوں سے تو بڑھتا ہے اور غم — رہنے دے میرے حال پہ اے مہرباں مجھے
معراج پر ہیں میرے تصور کی وسعتیں — ہر اک پہ ہو رہا ہے تمہارا گماں مجھے
بھولے سے یاد آگئی شاید انھیں مری — اتنا پتہ تو دیتی ہیں یہ ہچکیاں مجھے
بہرِ سجودِ شوق وہیں سر جھکا دیا — آئے نظر نقوشِ کفِ پا جہاں مجھے
مرجاؤں گا میں دیکھ کے برباد آشیاں — آزاد کر نہ بہرِ خدا باغباں مجھے
کیسے بیاں کرونگا بھلا اُن کے سامنے — کہنا پڑی گر اپنی کبھی داستاں مجھے

خواہش کروں بہشت کی میں کس سے اے ولی
رشکِ بہشت ہے مرا ہندوستاں مجھے

غزل

سید ممتاز حسین بصیر سابق طالب علم شیعہ کالج لکھنؤ

شہادت کا اپنی صلا چاہتا ہوں — تجھی کو فقط خوں بہا چاہتا ہوں
وہی حسن قدرت سنا چاہتا ہوں — میں کیا اور بتلاؤں کیا چاہتا ہوں
ہو صحرا کا ذرہ کہ دریا کا قطرہ — دلِ گمشدہ کا پتا چاہتا ہوں
کسی کا ہو در مجھ کو سجدے سے مطلب — میں ترویج نقشِ وفا چاہتا ہوں
غریب الوطن ہوں ہے جنت میں الجھن — میں اپنے وطن کی ہوا چاہتا ہوں
یہ کہکر دیا سر شہیدِ وفا نے — بقا بننے والی فنا چاہتا ہوں
ملا درد کے ساتھ دل مجھ کو لیکن — کوئی اور درد آشنا چاہتا ہوں
اٹھا دے مجاز و حقیقت کے پردے — کہ میں آمنا سامنا چاہتا ہوں

بصیر اپنے دل کی لحد کیا بناؤں
کسی کا ابھی نقشِ پا چاہتا ہوں

جلوؤں کو بحجاب کئے جا رہا ہوں میں

سید محمد ابوذر غفاری المتخلص بہ عارف درجہ نہم

نظروں کو بے حجاب کئے جا رہا ہوں میں — یعنی کہ بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں
شرمائیں تاکہ وہ نہ کبھی دیکھ کر مجھے — یوں اُن کو بے حجاب کئے جا رہا ہوں میں
ایسی پسند آئی ہے کچھ تیرے در کی خاک — سجدے جو بحجاب کئے جا رہا ہوں میں
کیوں بڑھ گیا ہے جوشِ جنوں اسقدر مجھے — جو اُن کو بے حساب کئے جا رہا ہوں میں
ہنگامِ نزع آپ سے شکوہ ہے نے گلہ — کیا کار لا جواب کئے جا رہا ہوں میں
کھاتے پھریں گے ٹھوکریں در در کی میرے بعد — کچھ ایسا انقلاب کئے جا رہا ہوں میں
عارف خدا کے خوف سے اپنے گناہوں کو — دنیا میں غرقِ آب کئے جا رہا ہوں میں

جرمن آگیا

احسن

اشخاص :۔

نواب صاحب :۔ پرانے زمانہ کے ضعیف وثیقہ دار

مرزا جی :۔ اُن کے مصاحب خاص۔

خان صاحب :۔ اُن کے خاص ملازم۔

منشی :۔ اُن کے انگریزی داں مدار المہام۔

بیگم صاحبہ :۔ نواب صاحب کی زوجہ محترمہ۔

وقت "قریب شام"

سین نمبر (۱)

نواب صاحب اپنے آدمیوں کے ساتھ پچیسی کھیل رہے ہیں

نواب صاحب :۔ (کوڑیاں کھنکھنا کر) لا ہٹلر پُو ..... (کوڑیاں پھینک کر) یہ پُو پچیس۔

مرزا :۔ یہ جرمن کا بھی کیا اقبال ہے۔ اس کے نام سے پُو خالی ہی نہیں جاتی۔

خان :۔ اس کا کہنا ہی کیا وہ تو دن دن فتح کرتا ہی چلا جا رہا ہے۔

منشی :۔ خان صاحب آپ سمجھتے ہی کیا ہیں وہ تو لندن بمبارڈ کرے گا۔ لندن۔

خان :۔ منشی جی آپ کے دماغ میں تو لندن بمبارڈ نے انڈے دیے ہیں۔ ابھی جو جرمن نے مار دے ہے تو آپ کہتے تھے کہ اب یہاں سے ولایت بالکل سیدھ پر ہے۔ سیدھی توپ جو چھوڑے گا میں گولہ گرے گا.........

نواب بھئی منشی جی یہ آجکل جو جرمن کا بادشاہ ہے ہٹلر.... وہ پہلی لڑائی کے وقت کون بادشاہ تھا

منشی حضور اس کا نام تھا قیصر۔

نواب قیصر نام تھا یا لقب۔

منشی سرکار نام ہی تھا اس کا قیصر۔

نواب اچھا تو یہ موجودہ ہٹلر ہے۔ یہ اس کا بیٹا ہے یا پوتا؟

مرزا سرکار میرے خیال میں تو پوتا ہے۔ منشی جی زیادہ جانتے ہونگے انگریزی بھی پڑھے ہیں۔

منشی جی ہاں مرزا جی آپ کی رائے درست ہے کیونکہ قیصر اور اس کا بیٹا تو لڑائی کے میدان ہی میں مارے گئے تھے اس وقت یہ پوتا نابالغ تھا اور جب بالغ ہوا تو بادشاہ ہوا اور تخت پر بیٹھتے ہی حضور والا انگریزوں سے لڑنے کی تیاریاں شروع کیں۔

نواب اچھا بھئی (کوڑیاں کھنکھنا کر) لا ہٹلر ایک اور سُو (کوڑیاں پھینک کر) آئیں یہ تو چار ہی رہے۔

خان سرکار نے تو اس کے ہر پہلے دادا قیصر کا بھی نام لے دیا تھا۔ بھلا کیسے پَو آتی۔

نواب اچھا خیر.. ایک دو تین چار پانچ چھ سات یہ آٹھ گھر پچیس اور یہ چار ہاتھ کے... لو خاں صاحب تمہاری چال ...... ابھی ٹھہرو خاں۔ ذرا ایک بات کریں .... اچھا منشی جی تم تو روزانہ انگریزی اخبار پڑھتے ہو یہ تو بتاؤ جو تم نے کہا کہ جرمن لندن پر بمبارڈ کریگا تو اس سے کیا فائدہ۔

مرزا یہ تو حضور عالیجاہ سیدھی سی بات ہے وہ آخر سرکار انگریزی سے لڑ رہا ہے اور لندن تمام انگریزی عملداری کا دارالسلطنت ٹھہرا۔ اس لیے وہ گولہ باری کرکے فتح کرے گا۔ پھر تمام انگریزی عملداری اس کی ہے۔

منشی سرکار بالکل یہی جو مرزا صاحب نے فرمایا۔

نواب تو پھر تمام انگریزی عملداری جرمن کے قبضے میں چلی جائے گی؟

منشی جی ہاں سرکار یہ تو ہونا ہی ہے۔

نواب تو ہمارے لکھنؤ میں بھی جرمن کا قبضہ ہو جائے گا؟

خان جی سرکار جب وہ تمام انڈیا لے لیگا تو لکھنؤ اس کے لیے کھی کے سر کے برابر ہے۔

نواب تو پھر وہ یہاں بھی آ جائے گا۔

منشی جی سرکار۔ بس لندن لیا اور یہاں آیا۔

مرزا جی ہاں جناب عالی وہ لندن لیتا ہوا فوج لیے ہوئے ادھر بڑھتا چلا آئے گا۔ اجی ایسا ہی جو کہیں کا ٹرا معجزنما ہے وہ!

نواب تو منشی یہاں آکر وہ کیا کیا کرے گا!

منشی بم کے گولے گرائے گا۔ سرکار بم کے گولے۔ سب بڑی بڑی عمارتیں گر جائیں گی۔

نواب اور آدمی سب پس کے رہ جائیں گے۔

مرزا سب تو کیا پسیں گے۔ سب کو پیس دیگا تو حکومت کن پہ کرے گا۔

نواب اچھا تو بڑے بڑے آدمیوں کو چھوڑ دے گا۔ راجہ، مہاراجہ۔ وثیقہ دار۔ رئیس۔

منشی جی نہیں سرکار اس کے یہاں بڑے آدمی ہیں ہی نہیں۔ سب قوم مزدوری کرتی ہے اور روپیہ سب ہٹلر کا ہے

نواب تو مہاجاؤں کو پیس ڈالے گا۔ اور ریاستیں چھین لیگا۔ اور ہمارا

منشی سرکار وہ کرتا تو یہی ہے۔ آخر پولینڈ میں یہی کیا اس نے اور بلجیم میں بھی۔

مرزا اے خدا نہ کرے اس شیطان کا سایہ بھی یہاں دکھائی دے۔

خان اسدہ موزوں یہاں آہی کب سکتا ہے۔ منشی جی تو بے غین ہیں۔ لندن کیسے بمبارڈ کر گیا ساب۔ ہمارے انگریز بہادر میں کوئی دم ہی نہیں جیسے کے۔

منشی خان صاحب آپ کیا جانیں آپ معلوم ہوتا ہے ابھی ملیح آباد سے رسی تڑا کر بھاگے ہیں۔ میں تو روز انگریزی اخبار پڑھتا ہوں جرمن کی فوجیں لندن سے کوئی پندرہ یا بیس کوس دور ہونگی۔

نواب ہاں انگریزی اخبار تو صحیح ہوتا ہے۔ منشی یہ خبر تم نے کس وقت پڑھی تھی۔

منشی سرکار آج صبح تڑکے

نواب تو اب تک تو شاید فوجیں لندن پہنچ گئی ہوں۔

منشی جی سرکار کوئی عجب نہیں۔

مرزا حضور۔ خداوند آپ گھبرائیے نہیں یہ منشی تو نرے جانگلوش ہیں۔ لندن تک تو اس ہٹلر کے باپ کیا دادا قیصر بھی نہیں پہنچ سکتے۔ خواب دیکھتے ہی مرگئے مردود۔

منشی مگر مرزا جی آپ تو خواہ مخواہ بگڑتے ہیں آپ ان باتوں کو کیا جانیں۔ یہ پالٹیکس ہے پالٹیکس! اور آپنے وہ مثل سُنی نہیں کہ اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔

نواب بالکل ٹھیک کہتے ہو منشی تم انگریزی داں ہو ممکن ہے کہ وہ لندن پہنچ گیا ہو اور یہاں آرہا ہو۔

(راستے میں ایک گولہ دغنے کی آواز آتی ہے)

(نواب صاحب گڑبڑا کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور چلاتے ہوئے بھاگتے ہیں " ارے جرمن آگیا ارے جرمن آگیا!")

سین نمبر (۲)

(اندرون خانہ۔ نواب صاحب داخل ہوتے ہیں دوڑتے ہوئے)

نواب ارے جیرمن آگیا۔

نوکرنیاں جی حضور سرکار۔ نصیب دشمناں کیا ہوا۔

نواب ارے قطاماؤں تم کیا جانو۔ بڑا غضب ہو گیا۔ بیگم کہاں ہیں۔

ایک نوکرانی سرکار بیگم صاحبہ تو برآمدے سے برات دیکھ رہی ہیں۔

نواب ارے برات۔ برات۔ یہ برات دیکھنے کا وقت ہے۔ قیامت کا وقت ہے۔ جرمن آگیا! ایسی بے فکری عورت سے پالا پڑا ہے!..... اور تم اندھیوں دیکھ کیا رہی ہو مردیوں۔ خدا تمھیں غارت کرے۔ بیگم کو یہاں کیوں نہیں بلاتیں گولہ وولہ سیدھا برآمدے ہی میں آکر گرے گا۔

(ایک نوکرانی لپک کر باہر جاتی ہے اور تھوڑی دیر بعد بیگم صاحبہ اندر آتی ہیں)

نواب ارے بیوی۔ ارے بیوی مجھے کہیں چھپاؤ۔ ارے بیگم چلو تہ خانہ میں چھپ رہیں۔ جرمن آگیا! آگیا!

بیگم اے میاں کیا تم سٹری تو نہیں ہو گئے ہو۔ یہ کیا اول فول بک رہے ہو۔ یہ جرمن کیسا آگیا۔ یہ نگوڑا جرمن کون مجھے برات دیکھنا دشوار کر دی۔

نواب ارے بیگم تم تو سمجھتی ہی نہیں ہو۔ گھر میں بیٹھنے والی ناقص العقل عورت۔ جلدی تہ خانہ میں چلو نہیں تو ہم لوگ پس کر رہ جائیں گے اور اگر...... ..

بیگم اے نواب میں کہتی ہوں یہ کیا پاگل پن ہے۔ تم سے تو میں عورت ذات اچھی۔

نواب اے بیوی تہ خانہ میں چلو وہاں سب باتیں کر لینا۔ غنیم تو دروازہ پر دھنادھن کر رہا ہے اور تمھیں اپنی بے فکری سے فرصت نہیں۔

بیگم اُہی یہ دھنادھن کیسی۔ کہیں دماغ تو نہیں چل گیا تمھارا۔

نواب تمھیں نہیں معلوم کہ جب جرمن آتا ہے تو گولے دغتا آتا ہے اور سب مکان گرا دیتا ہے۔ ابھی گولے کا دھماکا تم نے نہیں سُنا۔

بیگم گولے کا دھماکا۔ ارے وہ تو لالہ کندن لال کی لڑکی کی برات آ رہی ہے اس میں گولہ دغا تھا۔ صبوں کو مٹھائی آئی تھی اور پلاؤ بھول گئے۔

نواب اچھا تو وہ جرمن کے گولہ کا دھماکا نہیں تھا۔ آئیں۔ میرا تو دل اب تک دھڑک رہا ہے دیکھو بیگم دیکھو

بیگم ارے وہ تو گولہ میرے سامنے دغا میں تو برات ہی دیکھ رہی تھی۔ ہٹو بھی سٹری کہیں کے میری برات بھی کھوائی۔ سوانگ وانگ سب نکل گیا ہو گا۔

نواب مگر بیگم..... ہاں ہاں یہ برات ہی والا گولہ تھا۔ مرزا جی ٹھیک کہتے ہیں۔ انگریزی سرکار میں کوئی قدرت ہی نہیں جو جرمن آجائے گا کہیں مجال پڑی ہے جو قدم رکھ سکے لکھنؤ میں۔

بیگم جاؤ بھی وہ اینہی تمارے ساتھی۔ پاگل موے نہ جانے کیا کیا بکا کرتے ہیں..... آئے ہوا ہے جرمن آگیا

جرمن آگیا عقل تو بچپنے ہی میں دو دھ کے ساتھ اگل چکے۔ جرمن آگیا۔ ہونھ۔ میں برات دیکھ رہی تھی واہ۔ تم تو موا سٹھیا دیا سب دیکھ پاتے ہو اور میں برات دیکھنے گئی تو ان پہ جرمن کا بھوت سوار ہو گیا میں جانتی ہوں اس موے منشی نے تمھیں ڈرایا ہوگا بھاڑ میں جائے موا تم سمجھتے ہو کہ وہ انگریزی کیا جانتا ہے کہ خدا کھیاں اتر کے آگیا۔ اور وہ موا انگریزی ونگریزی کچھ بھی نہیں جانتا۔ اس دن بیگم جانی کے دولہا کا تار آیا تھا اس موے سے پڑھا بھی نہیں گیا۔ یہ ایک دن دہلا کے تمھیں مار ڈالے گا اور میں پاگل ہو جاؤں گی۔ بس اچھا یہ تو بتاؤ کہ یہ موندی کاٹے جرمن کی بات کس نے نکالی۔

نواب وہ تو پچیسی میں میں ہٹلر سے پو مانگ رہا تھا۔

بیگم تو یہ کہیے آپ ہی سب جھگڑے نکالتے ہیں۔ اچھا تو آپ کو اس موے نام سے مجھے تو نکلتا بھی نہیں اس موے نام سے پو مانگنے کی کیا ضرورت تھی۔ اچھا جائیے جائیے آپ اپنی پچیسی کھیلیے۔ میں جاتی ہوں برات ابھی نکل ہی رہی ہوگی۔

ظریفانہ معلومات

سید بہادر حسین دلکش
فرسٹ ایر سائنس

(۱) مکڑیوں کی عمر عام طور سے دو تین سال کے درمیان ہوتی ہے۔

(۲) سب سے پیشتر اشتہارات اخبارات میں سنہ ۱۶۵۲ء میں درج کئے گئے۔

(۳) سینے کی مشین ہاتھ کی نسبت ۱۲ گنا تیز کام کرتی ہے۔

(۴) ایک شتر مرغ سے اس کی عام عمر میں ۵۰۰ پونڈ کے پر نکالے جاتے ہیں

(۵) دنیا میں تین ماریں بڑی زبردست ہوتی ہیں۔ (۱) شیر کا پنجہ (۲) اژدہے کی لپیٹ (۳) شتر مرغ کی لات

(۶) حیوانوں میں انسان کے علاوہ صرف کتا ہی ہر مقام پر پایا جاتا ہے۔

(۷) ایک پونڈ روئی میں ۴۰۰۰ میل تاگا کاتا جاتا ہے۔

(۸) فن طب کے ماہرین کی رائے ہے کہ چھوٹے بچوں کی بہترین ورزش ان کا چیخنا ہے

(۹) جزیرہ انڈمن کے باشندے دنیا کے انسانوں میں سب سے زیادہ کوتاہ قامت ہیں ان کا متوسط قد ۳ فٹ ۸ انچ طویل اور ۷۷ پونڈ سے کم وزن ہوتا ہے۔

(۱۰) ایک جوڑے خرگوش کی نسل دس سال کے عرصہ میں ختم ہو جاتی ہے۔

(۱۱) انگلستان کا شاہی تاج دنیا کے دیگر تاجوں میں سب سے زیادہ خوشنما ہے

(۱۲) کئی ایسی قسم کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں جو تیرنا نہیں جانتی

(۱۳) زمین کا وزن ——————

6100,000,000,000,000,000,000,000,0000,

گرام ہے۔

روزے کی جھک

تہذیب حسنین رضوی (درجہ ہشتم)

جماہی پر جماہی آ رہی تھی صورت افیونچیوں کی سی ہو رہی تھی ابھی دس بھی نہ بجے تھے کہ نظریں باورچی خانے تک جا جاکے پلٹ آتی تھیں کھانے کے معاملہ میں کچھ ایسی سنگدلی اور دیدہ دلیری سے کام لیا گیا تھا کہ سب کچھ خالی تھا اسی ششش و پنج کے عالم میں والد صاحب کا نادرشاہی حکم ملا کہ تلاوت قرآن کیوں نہیں کرتے۔ میں نے زبان روکتے روکتے کہہ ہی دیا کہ آنتیں تو قل ہو اللہ پڑھ ہی رہی ہیں۔ مزید قرأت کی کیا ضرورت۔ طبیعت کسی بات پر جم نہ رہی تھی کہ فوراً حضرت شکم کے پرائیوٹ سکریٹری دماغ صاحب نے ایک ترکیب بتائی کہ امرود کے باغ کی طرف امید دل کے قدم بڑھانا چاہیے وہاں جاکے درخواست گذارو شاید کچھ سماعت ہو جائے۔ گئے تو کس بھیس میں ایک طرف کی دیوار جو ذرا شکستہ سی تھی عزت و آبرو کے ٹکڑے کو گھر چھوڑتے ہوئے اس میں کود گئے دو ایک آوازیں بھی آئیں جن کا مفہوم محض یہ سمجھ سکے کہ وہ ملازم جسے باغ کی حفاظت کے لیے خود ہی رکھا تھا۔ اسی کی نادانستہ دعائیں ہونگی لیکن اس وقت پیٹ خالی تھا سوائے سُن لینے کے چارہ ہی کیا تھا۔ جھٹ دو امرود توڑے ان کی خوشبو ایسی تھی کہ مرزا ظاہر دار بیگ کے چچے کو شرمائے شبہ ہوتا تھا کہ یہ وہی امرود ہیں جنھیں کل تک آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا تھا۔ قوت شامہ لُطف اندوز ہو رہی تھی کہ سامعہ پر بھائی" کے لفظ نے ضرب کاری لگائی میرا چھوٹا بھائی جسے بکواس کی وجہ سے میں نے بقراط کا خطاب دیا تھا۔ آپ کو تتلی پکڑنے کا بڑا شوق تھا خود تو شکار فرما ہی رہے تھے مجھے بھی شرکت کی دعوت دی میں نے امرود کو مُنھ میں چھپا کے چپ رہنے کی کوشش کی مگر بقراط صاحب نے سوالات کا ڈھیر کر دیا۔ بھائی جان تتلی اُڑتی کیوں ہے۔ اگر اس کے پر چمکیلے نہ ہوتے تو کیا نہ اڑتی۔ بھلا آپ ہی بتائیے فلسفہ کی ایسی سخت گتھی میرے موجودہ دماغ سے کب تعاون کر سکتی۔ میں نے کہا "امرود کھاؤ گے" آپ نے سمع خراشی فرمائی کہ ہم تو صبح سے ابتک دو روزے رکھ چکے ہیں۔ اب یہ تیسرا روزہ دوپہرے ادھر نہ جائے گا۔ میں ڈرا کہ کہیں میرے روزہ پر ریسرچ نہ فرمائیں جیب تکرہ نکالتے ہوئے میں نے کہا اُس کی تم چیز لے لینا دیکھو کسی سے کہنا نہیں کہ میں نے امرود کھائے ہیں" وہ حضرت معنی خیز ہنسی کے بعد چپ تو ہو گئے مگر گھر پہونچتے ہی انکنی دکھائی اور بولے امی جان بھائی نے یہ انکنی دی ہے انھوں نے اپنے باغ سے امرود توڑ کر نہیں کھائے ہیں اس جملہ کا نکلنا تھا کہ ایک قہقہہ لگ گیا، بھابھی نے کہا "اجی حضرت اسکاوٹ میں دو ہی دن سے شرکت کی ہے ناگرہ دینا ابھی نہیں سیکھا معلوم ہوتا ہے کہ نیت خوب کس کے نہیں بندھی تھی اسی لیے سویرے ہی کھل گئی۔

لیکن پیٹ کی آگ کے لیے وہ چند قاش کب کافی ہوتے قوت ہاضمہ پورے شباب پر تھی شنا ہی تھا کہ جنت کے پھلوں کو کھاکے ڈکار لیجیۓ اور ہضم۔ آج وہی سماں پیش نظر تھا جب وقت کاٹنے کے لیے اور کچھ نہ ملا تو شبیہ کا کیمیگزین میں مضمون کی سوجھی کاغذ اور فاؤنٹین منگا یا ہی تھا کہ رکھے ہوۓ ٹیلیفون سے ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن کی صدا گونج اٹھی کان میں لگاتے ہی سنا چار باغ سے سندیلہ کس وقت ٹرین جاتی ہے" معاف کیجیۓ اسٹیشن سے دریافت فرمالیجیۓ" میں نے کہا ادھر میرے الفاظ تمام ہوۓ ادھر اخاہ آداب عرض! آپ ہیں مجھے آپ کو اپنا مخاطب پا کے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے یہ خیال کر کے کہ کوئی میرے گھر کے ہی ملاقاتی معلوم ہوتے ہیں۔ تب تو آواز ہی سے اچھی طرح پہچان لیا میں نے اپنی قوت حافظہ اور سامعہ کو ملامت کرتے ہوۓ ایسا جواب دیا گویا میں بھی پہچان گیا " مجھے بھی آپ سے گفتگو کا کافی اشتیاق تھا " میں نے کہا۔ کہاں سے میں نے یہ کہہ بھی دیا۔ ان کو شاید نیا نیا ٹیلیفون کرنے کو ملا تھا کہنے لگے " واجد علی شاہ نے بھی کیا عمدہ کھانے کھاۓ ہیں اگر تب ہوتا تو ان کا معتقد ضرور ہوتا واقعی عمدہ کھانا بھی قسمت سے ملتا ہے " میں نے کہا معاف کیجیے اس خیالی پلاؤ کو پکا کے کیا فائدہ اٹھاۓ گا اگر اس گرانی کے زمانے میں آپکے خیالی پلاؤ کی شہرت ہوگئی تو اچھی خاصی آمدنی ہو جاۓ گی سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوۓ کہنے لگے ہم لوگ خدا کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اس جنگ کے زمانے میں پیدا ہوۓ۔ بھئی امریکہ نے تو اسلحہ سازی میں ایک ریکارڈ قائم کر دیا اطمینان کوئی انگریزوں سے سیکھے۔ گاندھی نے ملک کی ناک رکھ لی اب بھی کوئی اس کا ثانی نہیں۔ میرے یہاں ایک بلی ہے جو چوہوں کو بھی پکڑ لیتی ہے حسب سے میرے پیر میں درد اٹھا ہے بولا بھی نہیں جاتا میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اگر ان سے بولا جاتا تو آج سب کچھ کہہ جاتے غرضکہ ان کے منتشر جملوں کو سن لینا میرا ہی کام تھا۔ میں نے صرف ایک جملہ کہا کہ ایک مولوی صاحب ذاکری کے سلسلہ میں فرما رہے تھے کہ رمضان میں شیطان قید میں ہوتا ہے آج سے یہ اعتقاد میرے دل سے اٹھ رہا ہے۔ وہ یا تو سمجھ گئے یا کہنا ہی چاہتے تھے کہنے لگے معاف کیجیے روزہ کی جھک میں میں بہت سی بیکار باتیں کہہ گیا، غالباً آپ کو میرا نام یاد نہ ہوگا۔ میرا نام فقط اکبر علی بقلم خود ہے۔

گھڑی نے چار بجا دیۓ ماسٹر صاحب کے آنے کا وقت ہو گیا۔ اس کاغذ پر اس مضمون کا عنوان روزہ کی جھک دو ایک لائن اور لکھ پایا تھا۔ ایسا برا معلوم ہوا کہ اگر یہ ٹیلیفون نہ ہوتا تو وقت یوں نہ ضایع ہوتا جب ابھی کان میں لگاۓ ہوۓ تھا زور سے ٹیک دیا کھڑکی کا ایک شیشہ بھی ٹوٹ گیا اتنے میں والد صاحب تشریف لائے فرمانے لگے اگر روزہ نہیں رکھنا ہے تو کھا کیوں نہیں لیتے اس جھک سے کیا فائدہ ــ اب مجھے معلوم ہوا کہ میں بھی اسی جھک میں تھا ان صاحب کا دل میں شکریہ ادا کیا کہ ان کی وجہ سے مجھے جھک سوار ہوئی اور اسی جھک نے والد صاحب کی نظروں میں مجھے روزہ دار ثابت کر دیا۔



یاجوج ماجوج



سید مبارک حسین
درجۂ دوازدہم

برادرم ہٹلر و کامریڈ مسولینی!

سُن لو جہان میں ہے تمہارا فسانہ کیا — کہتی ہے تم کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

باولاد آدم کی اولاد میں مولانا ڈارون نے جو نام پیدا کیا ہے وہ ان کے بعد ان کی سات پیڑھی کو بھی نہ نصیب ہوا ہوگا۔ مرحوم آجکل کے تعلیم یافتہ بے مہار نوجوانوں کی طرح جو اکثر اپنے دیسی باپ دادا کو ڈیم فول یا کالا آدمی کہہ کر اپنے ذاتی مغربیت نواز پوزیشن کو سماج کی نظر میں بلند کر لیا کرتے ہیں اپنے فلسفہ میں ایسا غرق ہوئے کہ بزرگوں پر لنگور اور خوردوں پر دم کٹے بھینسے کا فتویٰ دے بیٹھے جب لوگوں نے پوچھا کہ "جناب ذرا اپنی نسل مبارک کی ترکیب نحوی فرمائیے" تو جواب دیا "اسم بندہ مسٹر ڈارون ولد مسٹر فلاں ابن مسٹر فلاں پسر لنگور یعنی بندر"۔ پھر یاروں نے دریافت کیا کہ "جناب کی آبائی میراث یعنی دم"؟ تو فرمایا "وہ نذر ارتقا ہو چکی"۔

مولانا ڈارون سے پہلے اور بعد بھی نسل انسانی کے متلاشی فلسفیوں نے اکثر اس موضوع کی چھان بین کی ہے اور اپنے اپنے عمل جراحی کے نتائج کا اعلان کیا ہے۔ حکمائے ماسبق کا یہ بالاتفاق فیصلہ ہے کہ پہلے انسان یعنی آدم کی تعمیر جسمانی مٹی، پانی، ہوا اور آگ سے ہوئی یہ نتیجہ ہر پہلو سے صحیح بھی معلوم ہوتا ہے دور اول کے انسانوں کا مطالعہ کرنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ ان پر مٹی کا عنصر غالب تھا۔ کیونکہ وہ انتہائی منکسر مزاج ہوا کرتے تھے اور خاک نشینی ان کی زندگی کا جزو لازم ہوا کرتا تھا۔ آجکل آپ خود ملاحظہ فرمائیے کہ چوتھے عنصر کا کس قدر زور ہے۔ آدم و حوا کے لڑکے و لڑکیاں دونوں آگ برسانے آگ لگانے اور آگ بھڑکانے میں ہمہ تن مصروف ہیں بہر حال یہ ثابت ہوا کہ انسان روز ازل سے انسان ہے اور خاکی ہے نہ پہلے وہ کوئی کیڑا تھا نہ بندر۔

ہابیل و قابیل!

یہ انسان بشکل اولاد آدم سطح زمین پر پھیلنا شروع ہوا اور قدرت کی جانب سے عطا کی ہوئی تمام قوتیں استعمال کرنے لگا چنانچہ ہابیل کے مقابلہ پر قابیل نے سب سے پہلے انسان میں قتل و غارت اور آتش پرستی کی قوت کو ابھارا۔ پھر کیا تھا بھائی بھائی کا خون کرنے لگا اور اپنے پیدا کرنے والے کے احسان فراموش ہو گئے۔ ایک اودھم مچ گیا۔ آسمان زمین کے قلابے ملائے جانے لگے۔ زمین۔ زر اور صنف نازک کی جادو نظری نے مختصر سی دنیا میں ہلچل مچا دی

یاجوج و ماجوج

اس ہلچل کے بانی اور مورث اعلیٰ جو اب تک نوجوانوں کے معلم دین ہیں حضرت شیطان تھے۔ ان کے کاروبار کو ترقی

اور دنیا کی گہما گہمی بڑھانے کے لیے بلکہ یوں کہا جائے کہ حسن و عشق فتنہ و فساد کی رونقوں کو دوبالا کرنے کے لیے یاجوج و ماجوج کا اضافہ ہوا اس اضافہ کے زمانہ میں صرف برّاعظم ایشیا اور برّاعظم یورپ زیرِ نظر تھے۔ نئی دنیا یعنی امریکہ پردۂ غیب میں تھا۔ چنانچہ بڑے صاحب یاجوج بڑے برّاعظم ایشیا میں تعینات کیے گئے اور افواج شیطانی کے سپہ سالار کیے گئے اور چھوٹے ماجوج برّاعظم خورد یعنی یورپ کی طرف روانہ کیے گئے۔ چھوٹے جناب ماجوج زیادہ منچلے تھے اور طبیعت میں تیزی بھی تھی۔ عاشق مزاجی فطرت میں داخل۔ عیش و عشرت زندگی کا جزو تھا۔ بڑے یاجوج میں تمام بری خوبیوں کے ہمراہ قدرے بردباری تھی۔

برادران عزیز یاجوج و ماجوج میں آپس میں بڑی محبت تھی دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہونا چاہتے تھے چنانچہ یہ طے ہوا کہ ایک ہزار سال بعد ایک زمانہ وہ ضرور آئے جب ہم دونوں اپنے فرائض ادا کرنے کے بعد آواگون کے اثرات سے انسانی شکل میں دوبارہ جنم لیں اور ایک ہی برّاعظم میں نمودار ہو کر آپس میں بغلگیر ہوں۔ چنانچہ معاہدہ ہوا کہ آئندہ زمانہ میں چونکہ یورپ کے مناظر اسکی پریاں۔ اسکی آزادی۔ اسکی مادی ترقیاں اس کا فلسفہ سائنس انتہائی دلکشی کی منزل پر ہوگا لہذا دونوں کے دونوں وہیں خروج کریں۔

نوک جھوک

آخر کار یاجوج و ماجوج بوسیلہ آواگون پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش سے راقم الحروف واقف نہیں۔ خدا کرے ایسے فتنہ و فساد برپا کرنے والوں اور بنی نوع انسان کا بے دریغ خون بہانے والوں کے جنم پتروں سے ہر ذی ہوش غافل ہی رہے تو بہتر ہے۔ کہاں پیدا ہوئے؟ اسی یورپ میں جہاں روز ازل ان دونوں نے معاہدہ کیا تھا ایک پروشیا کی زرخیز زمین پر دوسرا پادریوں کی دعاؤں سے اور گرجوں کے مقدس گھنٹوں کی آواز سے پاک کی ہوئی سرزمین روم پر گویا رحمان کے گھر شیطان پیدا ہوا اور پیدا ہوتے ہی جنگ و جدل کا بازار گرم کر دیا جوان ہونے پر اپنے نفوس کی پیاس بجھانے کے لیے انسانی خون کی ندیاں بہانا شروع کر دیں اور وہی پرانی ہلچل مچائی

شطرنج کی چالیں

تمام نئی و پرانی دنیا ایک بساط بنی ہوئی ہے۔ چالیں چلی جا رہی ہیں، رُخ دیئے جا رہے ہیں فیل اور گھوڑے کے بجائے ہوائی جہاز اور ٹینک دوڑائے جا رہے ہیں۔ پیادے اپنی جگہ پر دار انسانوں کو دے چکے اگرچہ ان کو یہ نہیں معلوم کہ ع۔ قضا چیونٹی کی جب آتی ہے اس کے پر نکلتے ہیں۔ بھیا یاجوج۔ تمہارا عاقل وزیر ہر ہر گنگا کرتا ہوا انگلش چینل پار کرتے ہی اردب میں آ چکا ہے اسکی ایک ٹانگ ٹوٹ چکی ہے تم بڑھے چلے جاؤ۔ ابھی شہ سے ذرا دور ہو روس کا گھر اور مصر کا خانہ تمہاری خیالی بلکہ موہوم فتح کی صبح ہونے سے پہلے تم کو مات کے نقشے میں پھنسا کر رہیگا اور اپنے بھیا ماجوج سے کہنا کہ اسکے سفید پیادے حبش کے کالوں سے مار کھا چکے ہیں جو باقی ہیں وہ بھی اردب میں آئے ہوئے ہیں

یاجوج کی سرگرمیاں

میاں یاجوج تم برسر اقتدار آتے ہی اوقات سے آگے بڑھنے لگے۔ تم کو شاید یہ نہیں معلوم کہ طمع کرنے والے کا انجام ذلت ہے جو دونوں ہاتھوں سے ٹھونستا ہے وہ آخر میں تہی دست ہوکر رہتا ہے ناروے کی ہائے غریب ڈنمارک کی کمزور بیواؤں کی آہ اور کریٹ کے یتیم بچوں کا صبر خالی نہ جائے گا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ فرانس کی بد اعمالیاں وہاں کے ستم رسیدہ عیش پرستوں کے نالوں کو بام فلک تک نہ پہنچنے دیں۔

ماجوج کی سرگرمیاں

سانپ کی پھنکار سے پہلے اس کے دانت توڑ دینا چاہیے جس وقت کامریڈ مسولینی نے بیکس صلح پسند قوم حبش کے خلاف اپنی زور آزمائی کی تھی دنیا نے شور بلند کیا تھا کہ اسی وقت دو دو ہاتھ لڑ لیے جائیں۔ مظلوم کی اعانت بھی ہوجاتی اور ظالم کی ہمت پست بھی۔ مگر افسوس دوستوں نے نہ سنا آخر کار ہمت بڑھی اور آج نتیجہ ظاہر ہوگیا۔ سب نے دیکھا کہ ماجوج نے کیسی آفت مچائی اور بنی نوع انسان کا خون بہایا۔ کس کی کمک پر؟ اپنے بڑے بھائی یاجوج کے بل بوتے پر۔

شکست یا فتح

ایک طرف یاجوج و ماجوج کی خونی سرگرمیاں دوسری طرف صبر و استقلال کے حامل انگلستان کے رہنے والے یاجوج و ماجوج کے بے پناہ مظالم کو چہ پدی چہ پدی کا شوربہ سمجھکر اس طرح نظر انداز کر رہے ہیں گویا ان کے نزدیک اتنی بڑی جنگ کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی۔ گھر لٹ رہا ہے مکان جل رہے ہیں۔ زندگی کا سرمایہ برباد ہو رہا ہے۔ اس طرف گولوں اور گولیوں کی موسلا دھار بارش میں ڈربی کے گھوڑوں۔ ٹینس کے میچ۔ ایم سی سی کرکٹ۔ ڈونس بال۔ سالگرہ شادی بیاہ سب حسب دستور جاری ہے اور بیک وقت روس کی امداد مصر پر دھاوا۔ سوئز کا بچاؤ برلن پر بمباری۔ مشرق کا خیال۔ مغرب پر قابو بھی ہو رہا ہے۔ لندن پر سخت گولہ باری ہو رہی ہے۔ ہر طرف آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں مگر وہاں لندن کے لیے نقشہ تیار ہو رہا ہے۔ کہیں نصف مکان جل چکا ہے مگر نصف شکستہ کمرے میں اقتصادی مسائل حل ہو رہے ہیں۔

اللہ ری متانت۔ اللہ رے استقلال یہاں تو سو دو سو میل پر کسی ہلکی سی آندھی آنے کی خبر معلوم ہوتی ہے تو پنکھے لگ جاتے ہیں آئے حواس گم ہوجاتے ہیں نہ کہ گھر میں آگ لگے اور ہم سنجیدگی سے بہ حاضر دماغی ملکی مسائل پر غور کریں۔ غیر ممکن کہو بھیا یاجوج و کامریڈ ماجوج کب تک تمہارا گولہ بارود کام دے گا۔

انجام کیا ہوگا

مسٹر جان گڈاہائی (Mr. John Gidahai.) سفیر امریکہ فرماتے ہیں کہ اگر جنگ جلد نہ ختم ہوئی تو لمبی ہوجائے گی۔ مسٹر چرچل وزیر اعظم کا بیان ہے کہ فتح برطانیہ کی ہوگی۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ دنیا کو زیر نگین کرنے

کا خبط نہ گھر کا رہے گا نہ گھاٹ کا۔ بہر حال پشین گوئیاں ایک جانب یعنی تنکے کا اوٹ پہاڑ اور بات کا بتنگڑ ہر شخص بنا سکتا ہے کی ٹھیکری چکی کا پاٹ بن سکتی ہے۔ خدا جانے غیب کیا رنما ہو۔ ایسی حالت میں نہ میاں منجم کا پانسہ مدد کر سکتا ہے نہ پیر منتر والے ماش کے دانے۔ موجودہ جنگ کا علم دریاؤ ہے۔ یعنی اور علوی اس باب کی پیشینگوئی کرتے ہیں ہم سے بھی اگر پوچھیے تو اعتقادات کی بنا پر ہم اس کا فیصلہ دے سکتے ہیں۔

فیصلہ

سنئیے! جب یاجوج و ماجوج کے مظالم انتہائی عروج پر پہنچ چکیں گے تو مقدونیہ سے حضرت سکندر ذوالقرنین ثانی خروج کرینگے اور ان دونوں کو یعنی زمانۂ رواں کے یاجوج و ماجوج کو نیچا دکھا کر سوئٹزرلینڈ سے گزر کر آلپس Alps پہاڑوں کے کسی درے میں قید کرینگے جس کے ہر دو دہانوں کی جانب تانبے و جست اور سیسے کی مرکبی نصف میل چوڑی دیوار اٹھائیں گے اور دنیا ریڈیو سے بلند ہونے والی ہوائی لہروں سے یہ خبر انتہائی مسرت سے سنتی رہے گی کہ بھیا یاجوج و کامریڈ ماجوج روزانہ دن بھر اس مرکب دیوار کو چاٹ چاٹ کر نصف میل کی چوڑان سے چوتھائی انچ کی چوڑان تک لے آتے ہیں شام کو یہ سمجھکر دل ہی دل میں خوش ہوتے ہیں کہ دوسری صبح کو دیوار توڑ کر آزاد ہونگے اور پھر یورپ میں خونریزی کا بازار گرم کرینگے لیکن ہر صبح ان کی امیدوں پر پانی پھر جاتا ہے اور امن پسندوں کی اعجازی دعائیں اس دیوار کو پھر اصلی حالت پر لے آتی ہیں۔

عورت

علی رضا

(اگر آپ مرد ہیں تو یہ آپ کے خاندان کی عورتوں کو چھوڑ کر سب کے لیے لکھا ہے اور اگر آپ عورت ہیں تو صرف آپ ان الزامات سے مستثنیٰ ہیں۔ دوسروں کو پڑھ کر سنائیے آپ خوش ہونگی)

(۱) بدصورت عورت ہمیشہ اپنے چال چلن اور سیرت کے متعلق گفتگو پسند کرتی ہے۔

(۲) عورتیں تمھاری طرف نہیں دیکھیں گی وہ چاہتی ہیں کہ تم اُن کی طرف دیکھے جاؤ۔

(۳) سوسائٹی میں اگر تم کسی عورت سے مل کر اس کی تعریف نہ کرو تو تم گنوار اور جاہل ہو۔ اگر تعریف کرو تو وہ تم کو خوشامدی احمق اور اپنا محبت کرنے والا سمجھے گی اور اگر اسپر ظاہر کرو کہ تم کو اس سے محبت ہے تو تم اس کے نزدیک اول درجے کے گندے ہو۔

(۴) اگر کسی عورت نے تم سے کوئی راز بتایا ہے تو تم کسی اور سے نہ کہو۔ یقیناً وہ اُسے پہلے سے بتا چکی ہوگی۔

(۵) عورتوں میں مردوں سے کہیں زیادہ اپنے کو امیر ظاہر کرنے کی عادت ہوتی ہے۔

(۶) اگر کوئی عورت تم سے کسی وقت محبت سے باتیں کرے تو اس کو خطرہ کا الارم سمجھو بہت جلد تم پر کسی فرمائش کا عذاب نازل ہونے والا ہے۔ یہ فرمائش محبت کے متناسب ہوتی ہے۔ جتنی زیادہ محبت کی باتیں ہوں گی اتنی بڑی فرمائش۔

(۷) عورت مرد کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے جس طرح کوئی مغرور جاہل کسی عالم کو۔

(۸) حقیقت میں عورتیں بندر سے بنی ہیں انکی نقل کرنے کی عادت اپنے آباؤ اجداد سے بھی زیادہ ہے۔

(۹) عورت بغیر تعریف کے زندہ نہیں رہ سکتی۔

(۱۰) عورتوں میں کم سن بننے کی فطری عادت ہوتی ہے۔

(۱۱) خواہ کسی صورت میں ہو۔ مرد کا سب روپیہ عورت پر خرچ ہوتا ہے۔

(۱۲) عورت سایہ ہے۔ بھاگو تو تمہارا پیچھا کرے گی۔ تم اسے پکڑنے دوڑو تو بھاگے گی۔

(۱۳) عورت کو سب سے زیادہ جو بات کھلتی ہے نصیحت ہے۔ حالانکہ وہ خود نصیحت کرنے میں مہارت رکھتی ہے۔

(۱۴) میں عورتوں کو "بھولی بھولی دلچسپ حماقتوں" کا مجموعہ سمجھتا ہوں۔

(۱۵) عورتوں اور کتوں میں تین فرق ہیں۔ کتے اتنی ابتری نہیں پیدا کرسکتے جتنی عورتیں کرسکتی ہیں۔ فاخرہ لباس اور زیور نہیں پہن سکتے۔ خدا کا شکر ہے بول نہیں سکتے۔

(۱۶) اگر دو عورتیں یا اس سے زیادہ۔ مل کر تمہاری تعریف کریں۔ تو اس جگہ سے فوراً بھاگ جاؤ یقیناً تم کو الّو بنایا جارہا ہے

(۱۷) عورت فیشن کی غلام ہے۔ کاش شوہروں سے محبت کرنا فیشن ہوتا تو عورت فیشن پرست نہ ہوتی۔

(۱۸) اگر عورت کہے کہ اسکو لباس اور زیور کی پرواہ نہیں ہے تو سمجھ جائیے کہ یا تو اس کے پاس ہے ہی نہیں۔ یا بہت ہے۔

(۱۹) عورت نئے آدمی سے مل کر بہت خوش ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ نئی عورت سے ملیں تو وہ قہر کی آنکھوں سے دیکھتی ہے

(۲۰) عورت جب کفایت شعاری کرتی ہے تو سب ضروری خرچ کم کردیتی ہے۔

(۲۱) ایک عورت۔ زیور اور کپڑوں۔ دو چیزوں کو خدا کی بہترین نعمت سمجھتی ہے۔

(۲۲) عورت سب کچھ مرد کے زور پر کرتی ہے اس کی سب سے بڑی طاقت اس کی کمزوری ہے۔

(۲۳) اگر کوئی ہندوستانی عورت یہ سب پڑھے گی تو مجھکو جی بھر کے کوسنے دے گی۔ کوئی پڑھی لکھی لڑکی پڑھے گی تو سہیلیوں کو دکھا کر ہنسے گی اور مجھکو احمق سمجھنے کی کوشش کرے گی۔ کوئی مغربی لیڈی پھاڑ کر پھینک دے گی اور مجھکو لوفر سمجھے گی۔

کیا آپ جانتے ہیں؟

آغا شفاعت قاسم
وائس پریسیڈنٹ

لکھنؤ کی چکن، ٹنڈے کے کباب، صمد کے یہاں کی بالائی اور دودھ، امام باڑہ آصفی، فیض آباد کی راڑی گلاب باڑی۔ امامباڑہ بہو بیگم صاحبہ، اجودھیا کے بندر،

کرسی اور شکارپور کے بیوقوف چنانچہ دونوں مقامات کے بیوقوفوں کے بیوقوفی کا ایک ایک واقعہ جو دلچسپی سے خالی نہیں تحریر کرتا ہوں۔ ایک زمانہ کا ذکر ہے کہ کرسی کے ایک گھر میں شادی رچائی گئی دولھا اور دولھن والے دونوں اتفاق سے کرسی کے رہنے والے تھے جب دولھن بیاہ کے آئی تو سسرال والوں نے اسکے بیٹھنے اور رہنے کیلئے ایک الگ کمرہ تجویز کیا جس کا دروازہ بدقسمتی سے دولھن کے قد سے چھوٹا تھا جب دولھن دروازہ پر پہنچی تو بڑی دقت دلھن کو کمرہ میں لے جانے میں ہوئی کوئی کہتا تھا کہ دولھن کا قد چھوٹا کیا جائے اور کوئی کہتا تھا دروازہ اونچا کیا جائے ماشاء اللہ سے سب محلے والے جمع ہوگئے اور بڑی دیر تک جلسہ مشاورت ہوتا رہا نہ معلوم کیا طے پایا اور کس طرح سے دولھن کمرہ میں داخل ہوئی شکارپور کا بھی واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ایک صاحب کے گھر میں مرغی کے بچے نکلے وہ مرغی انکو لیے لیے گھوما کرتی تھی صاحب کی مسرت و خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی اتفاق سے بچے کنویں میں گر پڑے صاحب نے دوہائی دی سب محلے والے جمع ہوگئے اور یہ طے کیا کہ مرغی کو وہ جنا اٹھا کر کنویں کے اوپر سے بچوں کو دکھلائیں بچے ماں کی محبت میں لپک لپک

دلی کا۔ قطب مینار اور جامع مسجد
آگرہ۔ کی دال موٹ۔ پیٹھے کی مٹھائی اور تاج محل
کشمیر۔ کی شال اور زعفران اور چشموں کی شفافی۔

لاہور اور پنجاب کے پہلوان
ڈھاکہ کی ململ
حیدرآباد کے بٹن
علی گڑھ کے طالب علم
بنگال کی زلفیں
الہ آباد کے امرود
ناگپور کے سنترے
سلہٹ کی نارنگیاں
قندھار کا انار
گوپامئو کے بلٹر
شاہجہانپور کے پٹھان
اودھ کی شام
راجپوتانہ کی رات
بنارس کی صبح

ملیح آباد کے آم
شہدپور کے خربوزہ
سندیلے کے لڈو
فیض اللہ گنج کے گنّے
متھرا کے پیڑے
مہوبے کے پان
ہاپڑ کے پاپڑ
جونپور کے قاضی
بدایوں کے مُلاّ
کانپور کے غنڈے
میرٹھ کی قینچی
رامپور کے چاقو
پشاور کے مغلیہ

زندگی کی ایک شام

سید محمد ہادی
درجہ نہم

برسات کی ایک خوشگوار شام کو جبکہ آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے اور باد صبا ننھی ننھی پھوہاروں سے اٹکھیلیاں کرتی، پھولوں کی خوشبوؤں سے معطر دماغ کو تر و تازہ کرتی، موج ا م ——— تھی۔ ٹھیک ایسے ہی وقت میں اپنے کمرے کی کھڑکی کے قریب بیٹھا مطالعہ میں مصروف تھا۔ لیکن اس وقت کا منظر کچھ ایسا دلکش تھا کہ آخر کتاب بند کر دینا پڑی اور قدرت کی دلچسپیوں میں محو ہو گیا، اس محویت کے عالم میں ایک نہایت ہی سریلی اور دلکش آواز سنائی دی آواز کیا تھی جادو تھا جس نے ایک ہی لمحے میں میرے دل و دماغ پر تسلط جمالیا، میں بے خود ہو گیا اور پورے دھیان سے آواز کی طرف کان لگا دیے، کوئی پر درد لہجہ میں گا رہا تھا۔ "دکھ بھرا سنسار ہے بابا دکھ بھرا سنسار"

متعدد بار وہ اسی کو دہراتا جاتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ایسا شیریں نغمہ میں نے آج سے قبل کبھی نہ سنا تھا۔ آخر بے قرار ہو کر اسی آواز کی سمت چل پڑا۔ یہ ایک عورت کی آواز تھی جو دریا کے کنارے پتھر پر سر جھکائے بیٹھی گانے میں مصروف تھی، میں اس کے قریب جا کھڑا ہوا لیکن اُسے مطلق میرے آنے کی خبر نہ ہوئی۔ اس کی بند آنکھوں سے سیلاب اشک بہ کر حسین رخساروں کو تر کر رہا تھا، اسکا بوسیدہ لباس بھی اس کے حسن کو نہ مٹا سکا! اس کے کھلے ہوئے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ سچ مچ حسن کی ایک دیوی معلوم ہوتی تھی۔ میں اس دلخراش منظر سے متاثر ہوا۔ ارادہ کیا کہ اسکو اپنی طرف متوجہ کر دوں لیکن بولنے کی طاقت اب ختم ہو چکی تھی اور میں خاموش کھڑا اسکی طرف دردمند نگاہوں سے دیکھ رہا تھا کہ یکایک اُسنے گانا بند کر دیا اور کھڑی ہو کر ایکدم آسمان کو دیکھنے لگی، اب چاند بھی بادلوں سے نکلکر سارے عالم کو منور کر رہا تھا،

اس نے اس کی طرف دیکھا، قہقہہ لگایا۔ پھر اسی طرح گانے لگی۔ "دکھ بھرا سنسار ہے بابا دکھ بھرا سنسار"

چاند بادلوں کی اوٹ میں آگیا۔ چاروں طرف اندھیرا ہو گیا، اب صرف آواز آ رہی تھی، میں دم بخود کھڑا تھا، وہ مجھ سے بہت دور تھی۔ نہ معلوم کیا بات تھی۔ میں گھنٹوں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ہی آواز میرے کانوں میں اب تک گونج رہی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کیوں۔ اس آواز سے میں رنجیدہ رہتا ہوں۔ لیکن اگر میں یہ آواز پھر نہ سن سکونگا تو مجھکو اور رنج ہوگا۔

کیا میں پاگل ہوں؟

گورشیو دیال بھٹناگر
نگینوی

جب چاندنی رات کی پرسکوت فضا میں سب پریم کی نیند سو جاتے ہیں، ساری کائنات سوتی ہی
کھنوے بھی پریم میں پاگل ہو کر سو جاتے ہیں، کوئل بھی دن بھر پریت کی تان الاپنے کے بعد چپ ہو کر سو رہتی ہے۔ پریم کا
مارا پپیہا بھی "پی کہاں" "پی کہاں" کرکے پریم کی نیند سو رہتا ہے اسوقت میں اکیلا چپ چاپ بیٹھا کچھ سوچا کرتا ہوں ——
—— میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ "کیا میں تمھارے پریم کو پا سکوں گا"؟ میں نے اکثر سنا ہے کہ تم انترجامی (عالم الغیب)
ہو! تم پروردگار ہو! تم سب جگہ موجود ہو۔ میرے دل میں بھی۔ لیکن کیا میں تمھیں اپنا سچا پریم ارپن (نذر) کر سکا
ہوں؟ تم ہی بتاؤ ناتھ! تم ست ہو۔ چت ہو۔ آنند ہو۔ تم سب کچھ ہو! اے مالک دوجہان تم ہی بتاؤ کہ میں تم کو پا سکتا
ہوں؟ —— جواب دو۔ نہیں بولتے! آخر جواب تو دینا ہی چاہیئے۔ میرے سوامی تم نے سُن تو لی ہوگی۔ اپنے پریمی
کے پریم بھرے دل کی پکار، پھر بھی تم جواب کیوں نہیں دیتے؟ جب کبھی چاندنی رات میں تمھارے پریم میں پاگل ہو کر اور یہ
سوچکر کہ شاید تم کو پا سکوں گا، میں اکیلا گاؤں سے کچھ دور، اُن چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے بیچ میں جہاں جھرنے کا شیتل
خوشگوار، پانی ترنم ریز آواز سے بہ رہا ہو اور اس دلکش فضا میں جہاں جھینگروں کی آواز کے سوائے فضا بالکل خاموش ہوتی
ہو، اکثر ٹہلا جایا کرتا ہوں۔ وہاں مجھے تمھارے پریم کی یاد رہ رہ کر ستاتی ہے۔ آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ یہ ہیں پریم
کے انمول موتی، جنکو میں تمھاری بھینٹ چڑھانا چاہتا ہوں، کیا تم اس ناچیز بھینٹ کو سُوِیکار (قبول) نہ کرو گے؟ ——
—— میں اکثر ان خوبصورت پنکھڑیوں سے پوچھا کرتا ہوں کہ "کیا میں پاگل ہوں"؟ —— پھول ہنسنے لگتے ہیں، غنچے
مسکرا دیتے ہیں۔ اوپر چاند کھلکھلا پڑتا ہے، گویا تمام کائنات جاگ اُٹھتی ہے، کتنی دلکش ہوتی ہے وہ فضا! میں بھول
جاتا ہوں اپنے آپ کو، اپنے پاگل پن کو، ساری دنیا کو دنیا والوں کو ——۔

---

(۱) انسان مطالعہ سے مکمل ہوتا ہے، گفت و شنید سے چالاک ہو جاتا ہے اور تحریر سے اُسکے اندر صحتِ افکار پیدا ہوتی ہے۔ (بیکن)

(۲) ریاست اور خاندان کی عظمت حقیقی نہیں۔ انکی حقیقت سایہ سے زیادہ نہیں (ملٹن)

(۳) بڑے لوگوں کی زندگیاں بتاتی ہیں کہ ہم اپنی زندگی کو بھی کامیاب بنا سکتے ہیں۔ (لانگ فیلو)

(۴) زندگی اجل ہے قبر اس کی منزل نہیں ہو سکتی۔ (لانگ فیلو)

کیا مغربی تہذیب ہندوستان کیلئے باعثِ مضرت ہے؟

سید محمد حسن زیدی
درجہ نہم

"اَلنَّاسُ عَلیٰ الدِّیْنِ مُلُوْکِھِمْ" یہ ایک عربی مقولہ ہے کہ لوگ بادشاہوں کے دین پر ہوجاتے ہیں یعنی بادشاہِ وقت جو طرز اختیار کرتا ہے رعایا مجبور ہوجاتی ہے کہ وہ بھی اس رنگ میں رنگ جائے۔ انگریز ہندوستان میں تاجر کی حیثیت سے آئے لیکن ہندوستان کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اُٹھاکر بادشاہ نہیں شہنشاہ بن بیٹھے۔ انگریز آئے اور مغربی تہذیب اپنے ساتھ لائے اسکا اثر ہمارے دل و دماغ پر کیا ہوا وہ سطورِ آئندہ میں آتا ہے۔ غور و فکر کو چھوڑ کر اگر بالکل سطحی نظر سے دیکھا جائے تو بھی مغربی تہذیب اور ہندوستانی مزاج میں مشرق و مغرب کا فرق ہے۔ یورپ کی آب و ہوا، قدرتی بناوٹ ہمارے بالکل مخالف ہے۔ پھر وہاں کی تہذیب کیونکر ہمارے موافق ہوسکتی ہے، تہذیب کا دائرہ بہت وسیع ہے، علم و حکمت، طرزِ معاشرت، صنعت و حرفت، مذہبی عقائد، قومی احساسات اور دلی جذبات غرضکہ ان تمام باتوں سے انسان کی تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ یورپ اور ہندوستان میں وہی فرق ہے جو مادہ اور روح میں ہے، یورپ کا دماغ مادہ پرستی کا حامل اور ہماری طبیعت روحانی لذتوں سے پُرکیف ہے۔

ہندوستان کا وہ گذرا ہوا زمانہ جبکہ آریوں کا دَور دورہ تھا اس وقت بھی یہاں رشی مُنی روحانیت کا درس دیتے تھے۔ عالم و فاضل تو درکنار عام لوگ بھی روحانیت سے اچھی طرح واقف ہوگئے تھے، اسلام آیا، اُس نے ان خیالات میں اور چار چاند لگا دیے، ہر کام میں معبودِ حقیقی پر بھروسا تھا اور خلوص کیا جاتا اس کی عبادت کیجاتی تھی اُن ہی باپ دادا کی اولاد اب بھی ہندوستان کی آغوش میں پرورش پا رہی ہے۔

یورپ کو سیکڑوں برس ہوئے کہ روحانیت کا سبق بھُلا دیا، معبد گاہیں، اچھی خاصی تفریح گاہیں ہیں، جب مذہبی عقاید کا یہ حال ہو تو دنیاوی امور کس منزل پر ہونگے۔ اب میں "مُشتے نمونہ از خروارے" بیان کرتا ہوں کہ ہندوستان کو مغربی تہذیب سے کیا نقصان پہونچا۔

اوّل کسی قوم کی تہذیب سیکھنے کے لئے اسکی زبان کا سیکھنا بہت ضروری ہے۔ انگریزی تعلیم نے ہمارے نوجوانوں کو کہیں کا نہ رکھا۔ اس سے میرا مقصد یہ نہیں کہ انگریزی تعلیم تباہ کن ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عمر کا ایک بیش قیمت حصہ محض زبان سیکھنے میں گذر جاتا ہے پھر بھی کافی عبور نہیں ہوتا اور وہ وقت جو دنیاوی ترقی کا زمانہ ہوتا ہے یوں ہی گذر جاتا ہے، دوم مغربی تہذیب نے ظاہر پرستی کی لت ہمیں عجیب کردیا ہے، وضع قطع اور لباس میں ظاہرا تو سادگی ہے لیکن اسقدر تکلفات اس میں ہیں کہ انسان کا بہت سا روپیہ اس میں برباد ہوجاتا ہے، مثلاً کھلی اور بیسن کی جگہ صابن اور پاؤڈر (Powder) مسواک اور دتون کے بجائے برش (Brush) خط بنانے کے لئے سیفٹی ریزر (Safety razor) اور اسکے لوازمات، ٹائی باندھنے کے لئے گھنٹوں آئینہ کا معائنہ۔ کوٹ پتلون میں اگر روزانہ کریز (Crease) نہ ڈالی جائے تو لباس بھونڈا معلوم ہوتا ہے۔ سگرٹ، چرٹ اور سگار فیشن کا ایک جزو ہے جس کی ضرر رسانی کے لئے دلیل کی حاجت نہیں۔ ہندوستانی عطر و تیل کی جگہ سینٹ (Scent) لوشن (Lotion) اور کریم (Cream) نے لے لی ہے۔ اس سے اگر زیادہ نقصان نہیں تو یہ ضرور ہے کہ ہندوستان کی معتدبہ دولت بیرونی ممالک کو چلی جاتی ہے۔

سوم ۔ مذہب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان کو سکون قلب حاصل ہوجائے اور یہ اسوقت تک غیر ممکن ہے جبتک کہ بندہ اپنے معبود پر پورا بھروسہ نہ رکھے " انگریزی تعلیم " نے اس بھروسے کو بالکل صاف کردیا ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انسان بغیر ہاتھ پیر ہلائے خدا پر بھروسہ کرلے یہ تو کاہلی کا مترادف ہے بلکہ یہ ہونا چاہیے کہ جو کام ہم کریں اپنے خدا کی رحمت کے منتظر رہیں، لیکن انگریزی تعلیم نے ہندوستان کے نوجوانوں کے دماغ سے یہ چیز بالکل نکال دی ہے ۔ اسکے اثرات ایسے خراب ہیں کہ اگر انسان کسی چیز میں کامیاب ہوجاتا ہے تو فرعون ہوجاتا ہے اور اگر ناکام ہوا تو پست ہمت ہوکر کہیں کا نہیں رہتا ۔

چہارم عورتوں کی آزادی ۔ سب سے زیادہ مہلک مرض جو مغربی تہذیب سے پیدا ہوتا جاتا ہے، وہ عورتوں کی بے جا ۲۶
آزادی ہے ، اسکا مطلب یہ نہیں کہ عورتیں مقید رہیں بلکہ انسانی زندگی میں ایک دوسرے کا چولی دامن کا ساتھ دیں ، چونکہ ایک دوسرے کی جنس مخالف ہے لہذا فطرتاً کام بھی مختلف ہونگے ۔ اس کی تقسیم عمل یوں ہونا چاہئے کہ تدبیر منزل یعنی امور خانگی میں عورتیں کاروان سالار بنیں اور سیاسیات مدن یعنی بیرونی کاموں میں مرد ۔ لیکن انگریزی تہذیب نے عورتوں اور مردوں کے کام میں کوئی امتیاز نہ رکھا اسکا نتیجہ بدچلنی آوارگی کے ساتھ ازدواجی زندگی کو دوزخ بنانا ہے جس سے انسان کو نہ لطف حاصل ہوسکتا ہے اور نہ اولاد تندرست پیدا ہوسکتی ہے ، خصوصاً ہندوستانی مردکے لئے تو موت کا پیغام ہے ۔

یہ چند باتیں بالکل سرسری ہیں ورنہ ہزاروں باتیں ایسی ہیں جو ہندوستان کے دل ودماغ میں گھن کی طرح لگی ہوئی ہیں اور ترقی کے بجائے ہندوستان کو ایک ایسے قعر مذلت کی طرف لئے جارہی ہیں کہ اسکا نام ونشان صفحہ ہستی سے مٹاکر چھوڑینگی ۔ ہمارے قومی بزرگ اور اساتذہ جن کو قوم کی تعمیر میں بہت بڑا دخل ہے اس بات کی کوشش کریں اور ہندوستان کو بچائیں ؎

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

RIVERS OF TASTE !

By S. Husain.

General.

The most remarkable river in the world is doubtless the so called Ink River in Algeria. Its name is not symbolical, it merely states the truth, which applies not only to the colouring of the water but to its chemical composition as well. In fact, this is a stream of real Ink. The liquid is thick enough to be used for writing.

Another unusual river is in the State of Nebraska, U. S. A Its water is sweet. This river came into existence quite unexpectedly in 1930, and has since then increased in size

A stream marking the boundary between Chile and Argentine is known as the Acid River by reason of the fact that its water is almost as acid as lemon juice.

Finally, there is a river in East Africa, called Engari Nikari, whose water has detrimental effects on animals, which drink it.

*   *   *   *

A man, Paul de Rio, born in Spain, is eighteen years old and weighs 12 pounds. He reaches no higher than the knees of a six-foot person.

Egg-eating competitors are popular in Australia; no less than 233 fried eggs were consumed by four men at a single sitting. The warner managed 63.

The greatest height above the earth attained by man is 30,000 ft. or (more. than 10 miles.)

The weight of our Earth is 12,500,000,000,000,000,000,000,000 lbs.

The diameter of the moon is 2162 miles.

• • • •

SCIENTIFIC FACTS.

By Chaudhri Zafar Ahmad

The well known Doctor R. B. Harn of St. Paul has found 'that if fruits are placed in Ethylene gas (C_2H_4) they ripen in a few hours. Besides this, the fruits remain protected from insects and birds. They become sweet and pleasant." His theory has been experimentally tested by Chemical Society in America.

• • • •

In Europe a bicycle has been invented which can run over rails.

• • • •

Dr. C T Bates of England has proved that the metal Almunium (Al) is very harmful to health. He found out after experiments, that if we heat water in an almunium pot for half an hour, a compound Almunium Hydrocyanide is formed and this compound is harmful to health.

In Berlin there is an area of 4 1/2 sq. metre which is known as " Electric Fields." In this area the crops are grown by the supply of electric heat. Here we can get the crops ready at whatever time we like.

• • • •

An American Scientist has invented a machine which makes the crop ready in 13 days, dries it in 6 hours.

• • • •

Scientists have proved that unhealthy persons can be cured by the blood of not of healthy but unhealthy persons. A person in Raehmand Hospital was cured by the blood of an other man in Paddele Fegits Hospital. It has been the practice of doctors to take blood from a man who is suffering from a disease and inject it into the blood of another person suffering from another disease. But they first find the relation between two diseases.

• • • •

Perhaps you Know?

THE LONG AND THE SHORT OF IT.

India's population is 1/5th of the world's population, 196 persons to the square mile.

Bengal has the biggest population and Baluchistan the least.

Bengal has the largest number of widows, 226 per thousand of women.

C. P. has the highest death rate 33.5 and Assam the lowest 23 8.

Jains have largest number of children 5 9 per family.

Christians have the biggest families in India 5 persons per family.

Madras has the biggest number of females, 1025 per 1000 males.

Punjab has the smallest number of females, 830 per 1000 males.

Ajmere—Merwara has the largest number of blind—383 per lakh.

India has the highest, birth and death average rate, 35 per 1000 death rate 33.3

Ahmedabad has the oldest Municipal Committee in India.

1/3rd of the illiterates of the world are to be found in India.

India produces 1/3rd of world's gold.

When did a man first ascend in a balloon? 21st November 1783.

The first man to cross the Atlantic in an Aeroplane was Commander A. C. Read of U. S. A.

German Airship "Graf Zaplin" (15th August 1929) was the first to fly round the world.

The Record time of a round-the-world flight is 8 days, 45 hours, 57 minutes.

mouth. There one finds every thing—male courage and gallantry on the one hand, and female grace, charm and beauty on the other.

Different drinks are ordered for, coins are counted in pockets and stealthy glances are exchanged from one to the other. Why delay the truth, the fact is that as long as one has got pennies in his pocket, one cannot remain without a partner!

Partner! partner! as a common exclamation from every gentleman's mouth if carried too far generally leads him to the Blue Heaven, Skating Halls or Billiard Tables!

There is adventure in accidents while skating and romance in the Ball Room presentations. "May I have the pleasure to dance with you"—the sentence seems to tickle every gentleman's heart and seems to come out of his mouth automatically, when he sees a pretty maid.

To be brief Hazratganj presents a scene, not of shops but of 'hops'—that is why ladies and gents in fashionable dresses look agile, smart and active with eyes gleaming with joy—a joy, of a peculiar type and indescribable in words. Every body that enters the place feels himself plunged headlong into the sea of romance and comes out of it with a pleasant and lighter heart. The fact is that Hazratganj is a theatre for cupid's play. A person may enter it lonely, but on return one finds oneself doubled—perhaps doubly lost!

An Evening in Hazratganj.

BY

C. D. Bhatnagar. C. XII.

A man may have lot of wealth to be called aristocratic, may have the best education to be called civilized and may display the best possible manners with the most fashionable dresses to be called cultured and polished in society; but, unless he sailed for Paris from any corner of the world, inspite of all his beautiful possessions, he is said to have nothing. It is there that the living models imported from different corners of the world receive finishing touches and a brighter polish that is everlasting. That is why a person feels justified and proud of the fact that he is 'Paris returned.'

In Lucknow, the capital of U. P., the centre of culture and decency in Northern India, we have Hazratganj. To add more laurels to its name Hazratganj is the most decorated of the decorated places, and in the most modern of fashions.

The place with all its charms—the beautiful shops, the grand 'Talkie's Houses,' the decent cars and above all fashionable frocks and saris--is always like a vision in the imaginative eyes of every fashionable 'Hazratganj Goer.' The place attracts the decent people from every corner of the city like a magnet. The liveliest time is usually the evening. There are different motives with which different people go out for a stroll there.

Streams of cars and tongas are seen pouring into Hazratganj through an avenue of electric lights. At the crossings there is generally the division. A number of ladies and gents are seen advancing towards the shops, most of them merely to display their purchasing capacity by stepping in and out. The majority are seen moving towards the "Talkie Houses"; there to reach in time in view of previous engagements.

It is necessary to mention here that every gentleman's heart is tickled with a desire for romance and adventure. There is manifest in all directions, a great passion to enjoy "love walks". There are the 'Whites' and the 'Blacks'. Among the "Whites" walking hand in hand is usual, but the "Blacks", though they look a little awkard for the first few days, yet later on excel the "Whites" marvellously.

In many cases it is very pathetic to see lonely pants or frocks loitering about the sides of the road. For them the only consolation, in a decent and fashionable way, is to enter one of the Restaurant, places very much renowned for romance and adventure right from the beginning of things. Lot of table-and love-talks echo and the gossip of the town is perceptible running from mouth to

Mohamed Saleh, in his *Shah Jehan Nama* tells that the king Jahangir *desired* to be buried in the garden of his beloved wife, that the winds of heaven *might* blow over his tomb and the rain and dew fall upon it. And it was so. Noorjahan constructed Jahangir's tomb. At Shahdara strong willed Noor Jahan buried her lover husband. It is situated on the opposite bank of Ravi in Kashmir where he and she had forgotten in dalience the cares of state.

After him comes the reign of the magnificent builder Shahjahan himself. The most beautiful of all his buildings is of course the Taj, the mausoleum which stands over the grave of his dearly loved wife Arimand Banu. Prominent artists from Persia, Arabia and Turkey and some eminent persons of his empire constructed the plan of the Taj. After a considerable discussion, they built a model and finally represented it in marble. It was completed in 22 years and the total cost of building was 3 crores. "The Taj still remains the finest monument of conjugal love and fidelity in the world. No one who has not visited it can have an idea of its superb and enduring charm."

The most highly ornamented of Shah Jahan's buildings is Dewan-i-Khas. On the walls of the Dewan-i-Khas are still to be read the beautiful lines composed by Sadullah Khan in praise of the building raised by his patron's bounty.

اگر فردوس بر روی زمین است
همین است و همین است و همین است

If there be on earth a heaven of bless   It is this, it is this, none but this

The next note-worthy building completed by Shah Jahan is the Jam-i.Masjid at Delhi. It is one of the greatest mosques, of India. It stands on rocky ground of red stones.

During the reign of Aurangzeb, art declined for he was a Puritan and had no interest in arts and architecture. The buildings he has constructed are the little marble mosques in Benares on the ruins of Vishwanath temple and the Badshahi mosque in Lahore. These are the last fading rays of architecture of Moghul Empire and are the latest specimen of Moghul style of architecture.

much interest in architectural splendour. Most of his time was spent in removing the troubles prevailing all over India, so he found very little time to indulge in his artistic fancies. He built a mosque still seen at Fathe-abad in Hisar in the Punjab, and is decorated in the Persian style with enamelled tiles.

Akbar, according to Abul Fazal, was a great friend of good order and prosperity in business. He kept control over the price of building materials, the wages of crafts men, and collected data for forming proper estimates. He was influenced by Persian style and ideals. In his time, Hindu influences too had their full play. This emperor's palace in.the Agra fort, commonly called Jahangiri Mahal which contains the .Diwan-i-Am and the Diwan-i-Khas, is a convincing proof of the influence of Hindu style. But in design Akbar's buildings are more Persian than Indian though they differ from the Persian style in so far that colour has not been used at all. Marble which is only conspicuous by its absence has been freely used by Akber in the Persian Style.

The palaces of Akbar at Fatehpure Sikri are the important buildings. These buildings are constructed by expert Hindu master-builders and the influence of Hindu art is clearly manifest in them. Jam-i-Majid and Buland Darwaza are the two most important and perfect architectural achievements of India. Buland Darwaza is 176 feet in height. There is no other gate of such a height almost in the whole world. No other mosque has surpassed the Jam-i-Masjid. It is the *The glory of Fatehpore* and *'a duplicate of the Holy Place.'*

The tomb of Sikandra which is considered unique among the sepulchres of Asia, was constructed by Akbar himself. It remained incomplete in his time but his successor Jahangir finished it. Abul Fazal justifies Akbar's taste of constructing buildings in this way, "His Majesty plans splendid edifices and dresses work of his mind and heart in the garment of stones and clay."

Jahangir had tastes different from those of his father's. He loved painting much more than architecture. His reign was a time of gardens which enshrined the whole culture, the gates of which glittering with colours which shows like jewels in bright sunshine, whilst marble tanks and pavilions rose from their midst.

Jahangir even did not care to complete the tomb of his father, but Noor Jahan, his beloved, was not so negligent as he. She built a tomb in memory of her father. It is one of the earliest buildings in which *pietra dura* is employed. Akbar in Chiti's tomb first employed the art of 'inlay' and 'overlay' but the Itmad-ud-doulah superseded by the addition of the *Pietra dura* that is, inlaying precious stones of different colours in a most delicate manner.

round and hysterical sobs and screams were heard, and Mrs. Sheridan was carried out in a fit."

Twentieth century lags not behind. In India we have, Jinnah, Mahatma Gandhi, and Pandit Jawahar Lal, Pandit Malaviya etc. it is public speaking that has roused a feeling against the British Government, and has made the Congress reach its zenith.

Muslim League, a purely Muslim body has got so much popularity and backing is due only to its great speakers A good speaker is welcomed or finds his way into Congress, Muslim League, in council, in parliament and every where. A public speaker has miraculous effects and dances over the heart of the people. Herr Hitler enchants the people and makes them determined by his art of oratory.

MOGHUL ARCHITECTURE.

(A study of the art from 1556-1707).

BY

Mubarak Husain, C XII

The Moghuls were great builders and the buildings which they erected in all parts of the country, bear testimony to their magnificent architectural taste. The Moghul style of architecture, had foreign elements and the art of those countries influenced Indian efforts. "No doubt moghul style was a mixture of many influences, but it was more sumptuous and decorative than the style which preceded it. We cannot, however, fix upon any style and say, 'this is Moghul style', for it depended upon the personal taste of different Moghul Emperors."

The architectural School of designing houses was first founded by Babur. It would not be exaggerating if I say that Babur was as great a builder as a monarch. A new well-designed magnificent sight of a building gave him exquisite delight even exceeding the joy in a well-fought battle.

Babur did not like the Indian art and skill. He imported pupils of Sinan the famous architects from Constantinople to construct his buildings. He constructed many buildings but most of them were destroyed. There still exist the large mosque in the Kabul Bagh at Panipat and the Jam-i-Masjid at Sambhal.

After Babur, Persian influence increased on the Indian art and continued upto the end of Akbar's reign. Humayun was a lover of Persian style. He had not

Press and Platform in Modern World.

BY

Agha Shufaat Qasim Qazalbash, C. XII.

The twentieth century can afford to smile at the nineteenth. Our ancestors could hardly dream of the wonders of modern age. Though the age in which they lived seems a miraculous, a strange, and a unique thing, such wonders of science were never thought of even by geniuses.

Our fore-fathers could hardly get the news even of their own city, while we know by morning the tidings from the whole world. By the progress of science, the press has opened a new era in our social life. When it was in its infancy we could not get fresh news, but now by the inventions of aeroplane, wireles telephony and telegraphy we come to know all sort of important events, political, social, economical, accounts of adventure, acts of bravery, and tactics in war of the English, Germany, Russia, Chinese and Japanese generals on the following morning. We are early in the morning at tea, when we get a copy of the "Pioneer" having the treasure of knowledge. The Press is a machine which moulds, social economical, moral, and cultural activities of a country. Without it the progress of a country is a far-off question.

Politicians realise the worth and importance of the press. Party leaders and statesmen inform people about their views through this idol of worship. This is the root cause, why party leaders, politicians, statesmen have or need to have an organ of their own political world owes a great deal to the press. In the present War civilians are kept quiet only by the Press. And the military people are stirred and trained by means of press.

If we cannot have the pleasure of seeing the British Premier and President Roosevelt in the act of oratory we can have acqaintance with them through the news-paper. We can read their statement about India and present Indian situation. Such are the manifold blessings of the press, the herald of politicians, socialists, statesmen, generals, kings, and presidents.

What the press fails to do is achieved by the plate form speaker. The art of public speaking has its own merits and importance in every age. We cast a glance over the past days for a while and see how Babur, the Great by his oratory, put zeal and strength into his dejected army who had lost spirit by the unfavourable prophecy of a fortune teller. We see how Burke by his forceful and pathetic speech in the impeachment of Warren Hastings moved the whole audience present over there. His speech was so effective in the words of Macauley that "Handkerchiefs were pulled out, smelling bottles were handed

we shall have courage to say that a novel depends upon its characters; if characters we are good the novel is good and if characters are bad the novel has no value. The merit of a novel depends both upon the variety as well as the intensity of characterisation. In some writers, for instance, Jane Austen, all characters belong to one or two families. But in Dickens there is god's blenty. He focuses his attention on the whole of the English society of his times.

All sorts of men, rich and poor, good and bad, find their place in Dickens's novels; but his attention is focused specially on the lower middle class of the English society of his times, a class to which Dickens himself belonged. In *Great Expectations* we are closer to Pip, Joe, Biddy than to the Havisham family and the Pocket family. At the same time it is also necessary that the characters should be true copies from life. The author must have looked at them from an absolutely impartial and disinterested point of view. Such are the characters of Jane Austen and of Scott But not so of Dickens. His figures are mostly caricatures; women like Miss Havisham or even Estella or men like Compyson, Abel Magwitch are impossibilities in life. But this does not pull Dickens down his seat as the greatest of English novelists, for his characters are full of life, of full-blooded life and because of this most essential quality of characterisation his treasure house of characters remains the richest.

Both story and characters are unravelled by means of descriptions and dialogues and it is in the management of these, that the art of the novelist consists. But it is above all the novelist's expressed or implied philosophy of life that comes to colour the whole novel, to give it a special tone, to give the story a special turn, and the characters a family likeness. Sometimes as in Dickens the characters are crushed under the philosophy or the moral earnestness of the author. For Dickens the English society of his days was divisible into two main groups, the people who were gaining advancement under the developments of the modern age and those that were conservatives *i. e.*, adhering to the old virtues. It is clear from everyone of his novels that his sympathies lay with the latter. His reading of circumstances round about him was that all advancement under modern life provides us with great expectations that will never be fulfilled that are bound to end in disappointment; that on the other hand a sticking to the old conventional values will lead us to perpetual happiness. He found that the new type of men had everything except love while the old type of people had nothing except love. In *Great Expectations* Pips disappointment and Joe's eternal happiness inculcate the above moral. The addition of the last chapter in which Pip and Estella are married falsifies the philosophy and should have been excluded.

THE ART OF THE NOVELIST.

BY

Ghulam Asghar, C. XI.

We must put it down at the very outset that whatever a novel might be, but it is nothing if not a story. A novel is a story and always will remain a story. For a story it is necessary that it should be interesting and be put together skillfully. All the facts of a story should be arranged proportionally; all the incidents and characters must be revealed from truths that are admitted; the ordinary things should be made extraordinary and significant; the events described should be managed well and the catastrophe of a story should be made satisfactory collecting together all that has gone before. The plot of novel is generally of two kinds—loose and organic. A loose plot is that in which the story is composed of separate incidents, having but little of logical connection. Novels like *Robinson Crosoe* and *Pickwick Papers* have a loose plot, since they consist of a number of incidents that occurred one after another none depending upon the other, to the hero of the novel.

In an organic plot, on the other hand, the incidents as Hudson writes "are dovetailed together as integral components of a definite plot-pattern." In Dickens's *Great Expectations*, for instance, we find that the very first scene in which Pip meets the convict in the church-yard, is the most vital to the whole story. It is from here that all the incidents of the main story, take their start. Later on another story is introduced, that between Pip and Estella and for some time assumes such an importance as to make the first story appear unimportant by the side of it But these two main currents go on running side by side. Towards the middle of the story, we do not know and Pip himself did not know if his 'great expectations' were provided for by anyone else than Miss Havisham. It is only when the convict whom we met in the opening scene comes back to meet Pip and to tell him that he had been providing him with all the money to become a gentleman, that we come to the real facts. Pip's bounds with Estella are soon ofter loosened and the story comes to a close. If we miss any of the incidents we will not be able to follow the story well. The plot is a complete whole, organic, that is, having a structure like that of a living organism which will appear incomplete or will not be able to live if any part of it, is served from the whole body. In this natural scheme of things the last incident, the marriage of Pip and Estella comes as a shock, an incident imposed from without and it would have been better from the point of view of the story if Dickens had disregarded the public demand for a happy ending.

But characterisation is perhaps the most significant factor of a novel and

(6) Why would Mr. White, whose garden is without fences, disbelieve that his next door neighbour's peacock has laid an egg in his garden?

• • • •

(7) Is it possible for a man to marry his widow's sister?

• • • •

(8) The Professor on holiday telephoned to his Secretary! "Why are you not forwarding my letters?" he asked. "You forgot to leave me the key of your letter-box," she said. "How silly of me! I shall send it at once," he replied. He hung up the receiver and called a servant to get an envelope and stamp. Why is it likely that he still will not get his letters?

• • • •

Answers.

1. Left arm.

2. North.

3. Three.

4. (*a*) 34 is double of 17 (*b*) Exactly 1000 years after the out break of the Great War. (*c*) One dozen followed by 3 dozen. (*d*) The reverse of the famous date 1857.

5. Nine seconds.

6. Because peacocks do not lay eggs; peahens do.

7. He can't. If he has a widow he must be dead.

8. Because the envelope containing the key will fall in the locked letter-box.

to revert once more to the new habit will be considerable. School yourself against temptations to make exceptions. It will require self-discipline, but, in the end, what you achieve will be worth while.

Common Sense Problems.

BY

Prof. M. N. Zutshi.

Be absolutely fair with yourself and see what you can make of the following problems. The answers are given further on page 47; Do not see them until you have answered the questions.

1. My brother writes: "I have walked over from Delhi to-day, where I had the misfortune yesterday to break a limb." Can you tell from this which limb he probably broke—his right arm, left arm, right leg, or left leg?

• • • •

2. If you entered a certain house, you would find a window on your right in the side wall of the passage. When the sun sets it shines straight through this window on to the wall apposite. What direction are you facing when you stand in the doorway and look across the street?

• • • •

3. If there are an equal number of red and white balls jumbled in bags containing 144, what is the least number that would be necessary for you to take out at random to be certain of getting two of the same colour?

4. Suggest an easy way of remembering the following telephone numbers

(*a*) 1734 (*b*) 2914 (*c*) 1236 (*d*) 7581.

• • • •

5. If it takes a clock 4 seconds to strike five, how long will it take to strike ten?

• • • •

The fundamental principle is that the more often you do the wrong thing, the easier it will become to do it again. The more frequently you discipline yourself to act as you should, the more automatic, the easier, this will be. Once you discover you are developing a bad habit, the sooner you train yourself to act differently, the less efforts you will have to make in breaking the bad habits. If you merely let yourself drift, without mental effort to control the direction you take, you will form habits which will carry you along a path of least resistance. Then, unless you subject yourself to serve self discipline, you will drift still further, from bad to worse. If you had been careful to develop the right habits in the first place, although this might have required more efforts subsequently, life would have proceeded smoothly and been better regulated. Remember, it is easier to form a good habit than to break a bad one.

Of course you must have an ideal to copy in order to develop good habits. It is really a sad case when your parents, elders and teachers themselves lack in tidiness, method, perseverance, concentration, punctuality and similar other good habits that go to make man a man. You unconsciously imitate them and go down into the same unhappy rut which becomes difficult to leave. And still more unfortunate is the fact that if any one points you out your bad habits and wants to set you on the right path, you resent a great deal and are not prepared to take any pains in changing your ways.

Discipline yourself to create a habit involving a more satisfactory course of action. Do not hesitate to change. Concentrate until the new habit has become established in the place of the old one; until it has become mechanical. Make habit your servant, not your master.

The controlling or repressing of bad habits is difficult; but don't feel discouraged. It requires only will-power and serious efforts to root them out. You must first of all repress them, and then set to work to learn new and better habits up on. Built a second foundation of self-control. Just as the mountain stream that has cut its way into the rocks is hard to stem or divert to another channel, so an established bad habit cannot be repressed or changed to a new one, without mental disturbance.

When a habit is in the earlier stages of being cultivated consciously, either as a new form of activity or to replace another old one, there will come to you temptation to revert to methods. You may persuade yourself that just one exception will not matter very much. This is a most dangerous period. To permit a single exception will undo much of what you have achieved. The agreement between mind and body, that you have sought to make automatic, will be disturbed. You may even have to begin all over again. The effort then necessary

If you perform an action once, certain nervous and mental lines of communications are developed.

The first time you do any thing, the mental process involves a decision, a delay while the necessary adjustments are made as between mind and body. Just as the first time a key is turned in a lock, the mechanism is stiff and hard to operate. But after constant repetition, no delay at all ensues. You perform the action without any mental effort at all, and often without even being aware of what you are doing.

When we are born, we have our lives before us in which to form good or bad habits. Once formed, a bad habit is difficult to eradicate; but good habits are the foundation for a full and useful life. Habits formed in childhood nearly always persist, right through life. Habits of cleanliness, tidiness, method, perseverance, concentration, if cultivated during your early childhood, persist as invaluable assets when you reach more mature years.

Without habits our minds would be intolerably overworked. What would happen if every time you dressed you had to stop and consider what to do next? The answer is easy. It would take you perhaps five or six times as long, because each time you wanted to put on anything, you would have to decide whether you should lift the right or the left sleeve, and so on. Life in such circumstances would become intolerable. You would be so busy deciding what to do next that ultimately you would do very little—and probably even that little unsatisfactorily. So develop good habits to take care of the details of your life, then your mind will be fresher and free to grapple with the real problems confronting you.

Good habits, properly controlled and developed, are valuable assets; bad habits are a sign of mental weakness, poor self-training and result is disorganised living. Once formed, habits are difficult to break, regardless of whether they are good or bad.

Those of you who are unclean and untidy in your early life shall remain so throughout your life—a thing which others of good taste will hate in you. If you do not develop perseverence and concentration from the very beginning, you would lose these invaluable assets of your life and their loss will tell heavily on you for your success and happiness. Again, the more frequently you arrive late at school or college, the harder it will become to arrive in time. If you are not regular in your work at school you would never be regular in your work afterwards in life. So when these bad habits control you they will persist in your life and the result will be misery and unhappiness.

Aurangzeb felt her loss very bitterly. He buried her close to the big tank at Aurangabad.

And it was here, in the year 1707, that the old and weary Emperor himself, with his nerves shattered by a long campaign of twenty-five years duration against the Hydra-headed power of the Marathas, came to breathe his last.

To this day he lies buried nearer to his beloved Zainabadi Mahal than to any other of his wives or his kith and kin!

How habits can help you

BY

Prof. M A Zutshi, Physics Department, Shia College.

The human mind is a marvellous instrument. It provides us all with miraculous power But like other sensitive mechanisms it needs constant attention if it is to work at its best.

In all walks of life, in all our work and all our play, a certain average level of mental efficiency is necessary It may briefly be mentioned here how you use memory and concentration every day, how your habits are best if under your control instead of their controlling you, how your will-power and imagination both effect your daily life. But how much more important are qualities when you are engaged on the development of success and happiness!

You will want to concentrate on a useful book to get the greatest possible value from it. You will want to make certain that your powers of memory are such that you can retain and use the lessons you learn. Habits of happiness and industry you will certainly desire to develop. They are vital to keep your interest at the height which makes self-development an adventure rather than a task. Then with imagination to show you how to use what you learn and will-power to maintain your enthusiasm, how can anything stop you on the road to success and happiness?

For the time being let us leave the rest and consider only 'how habit can help you.'

First, let us examine what is meant by the term habit; then we can consider the next problem—the part habit plays in your daily life. In every day language, you may use the phrase "getting into a habit" in very much the same way as you sometimes speak of people "getting into a groove." In psychological language,

"I shall despatch Mir Khalil," said Murshid Quli, "and then there would be none to stand in Your Royal Highness's way. And as for my life it does not matter, as in exchange for my life my master's task will be done."

"Yes, Murshid, I appreciate your devotion to me. But this won't do..." and added after a pause, "No, Think of a less bloody way."

"Can't we induce Mir Khalil to yield, that girl up ?" asked the Dewan.

"Perhaps he won't give her. He likes her so much."

"But excuse me Your Royal Highness, people of Mir Khalil's sort do not like a woman for long. I shall go to him just now."

The shrewd Dewan got up and made the best of his way towards Mir Khalil's palace.

Two hours of great anxiety and expectation passed and the Dewan again stood before the Prince.

"Tell me all in a word what has happened," demanded the Prince petulantly.

"I have brought her here, Your Royal Highness."

"Brought here ! How !"

"This slave never expected such a complete success. Mir Khalil likes this girl but there is another girl, one Chatter Bai in Your Royal Highness's *harem* whom he likes much more and with whom he is willing to exchange his Hira Bai."

And the same day Aurangzeb's marriage with Hira Bai was celebrated in the right Islamic fashion.

*   *   *   *

Aurangzeb named her Zainabadi Mahal, and, the historian records, "became utterly infatuated with her."

"So completely infatuated was he that one day she offered him a cup of wine and pressed him to drink it. After many excuses and entreaties the Puritan Emperor was about to taste the forbidden drink, when she herself snatched the cup away, crying 'my object was only to test your love for me and not to make you fall into the sin of drinking."

"She must have been another Nur Jahan or another Mumtaz Mahal, and must have left as distinct a mark on the history of India as they did." But alas "death cut the story short when she was still in her blooms."

The Begum was just getting up to slap her when a deep groan from the Prince diverted her attention.

"Wait aunt, ' said the Prince faintly, "spare that girl. She knows nothing."

"All right, my son, then you yourself tell me the cause ?"

"I......But..."and theré he stopped.

"Why don't you go on ? Have you some trouble with your tongue ?"

"No, auntv. Yes I am suffering from a malady the cure of which lies in your hand."

"How ?"

"But do promise aunty to apply the balm if I show you my wounds."

"Yes, I'll do my best for you, my dear."

"Will you give me anything however precious that I ask of you ?"

"Yes, yes, my dear son, I'll give my life itself."

"Then listen, my malady is...! he faltered but went on after a pause. "Will you give this Hira Bai to me. I cannot live without her."

The Begum grew serious.

"Why aunt ?" the Prince enquired, "are you unwilling to part with her ?"

"No," she replied, "but you do not know how much your uncle, my husband, loves her. He does not care either for Shah Jahan or you. He would kill me and this girl too if he comes to know of this matter."

"That doesn't matter, aunt," said the Prince getting up, "I shall have a duel with my uncle."

"Do not be so rash, my son, said the Begum calmly, You used to be so cool, so calm and so crafty."

"Then what am I to do, aunt ?"

"Well, consult your ministers about how to induce your uncle to give this girl to you."

*   *   *   *

Early the next morning, after his prayers, Aurangzeb came back to his own quarters to discuss the matter with his confident, Murshid Quli Khan, Dewan of the Deccan.

At the sight of her nephew lying motionless on the ground, the Begum began to weep. The Prince appeared to be in a swoon. Rose-water and *Keora* was sprinkled on his face and he opened his eyes.

The Begum clasped him to her bosom and patting his cheeks asked ;

"what had happened to you, my dear ?'

The Prince kept perfectly silent.

"What malady is it ? Did you have it before ?''

The Prince was dumb-founded.

"Why are you silent ? Why ? Can't you speak ?"

The Prince was still speechless.

"Alas ! has this malady devoid vou of speech ?" she cried wiping her tears.

Hakims were consulted. But they could not diagnose a malady. And about the loss of speech they could not say a single word. The Begum felt seriously troubled. What could be the Prince's malady ? Who could tell ?

* * * *

It was midnight. The richly decorated chamber of the Begum was lighted up with wax candles. The Prince lay restless on his bed. The Begum sat at a distance on a Persian carpet, her back resting on a huge velvet cushion. A shadow of some human form appeared on the curtains every now and then. All at once the eyes of the Begum caught it.

"Who are you behind the curtain ?" she demanded in a stern voice.

A faint but sweet voice proceeded from behind the shadow : "Your Highness's slave-girl, Hira Bai !"

The Begum kept brooding for sometime and then called out ; "Come forward, Hira Bai."

Hira Bai appeared before her trembling.

"Could you tell me," asked the Begum, "what more did you see before the Prince fell under the tree?"

"Your Highness..." she said picking up courage, "Your Highness's slave-girl knows nothing more."

"Thou liest, jilt." said the Begum growing angry, "I'll kill you, or tell me the truth."

LOVE OF "THE PURITAN EMPEROR"

BY

AHSAN

"Hira Bai," says the historian of Aurangzeb, "is the heroine of the only romance in the Puritan Emperor's life!"

Aurangzeb first saw her, while yet a Prince and Viceroy of the Deccan in his aunt's palace-garden of Zainabad at Burhanpur. On his way to Aurangabad, the seat of his viceroyalty, he had stopped here to meet his aunt his mother's sister, the wife of Mir Khalil, Nawab of Burhanpur.

And here, one afternoon, he saw Hira Bai, standing under a mango tree, a beautiful maiden clad in rich dress and singing to herself in low tones. Perhaps unconscious of the presence of the august Viceroy, holding a branch of the tree in her left hand, she was coyly jumping up to pluck a mango. At the sight of her bewitching beauty and her mirthful spirits the strict religious bigot in Aurangzeb was completely lost!

"Who are you sweet girl? A *houri* from Paradise?" He fondly asked, drawing nearer.

The girl stood struck. Her heart began to beat fast. She could not but run away and hid herself behind a tree.

"Where hast thou fled, O vision divine," cried Aurangzeb, "Come hither, I love thee."

Her rosy face wet with sweat the girl stood behind the tree. She had heard that the Prince was strictly religious, and that he had no eyes for the charms of a woman!

The Prince was still continuing: "O if you won't come, I shall throw myself down and die."

And lo the proud viceroy laid himself down prostrate on the ground!

"Oh, what has happened to him!" thought she,

"I shall run and inform my mistress."

She escaped from her hiding place and ran towards her mistress's chamber. Even now the question was in her mind; "Has he really fallen in love with me? But I am the favourite girl of my master? I do like the Prince. But what can I do. I am a helpless woman! A poor slave-girl."

• • • •

the lower storey of the present building had become lecture rooms for various departments, and small rooms bore the inscriptions, "English Department," "History Department," "Mathamatics Department," "Civics Department" and so forth. It appeared that the whole of the building was meant for college classes. I particularly noted with satisfaction the inscription "Commerce Department" So at last, said I to myself, " Inter Com. is also available here." In the new wing on the other side was placed the Physics Department, and Chemistry Department had one more lecture room added to it.

I bagan to wonder where the school had gone, and came towards the Hall when lo ! at a distance there stood a double-storied building consisting of as many as fifteen rooms. Curious to see this building I crossed the field lying in between it and the college. There I found a small room for the Head Master, another, a little bigger room, for Head Master's Office and the rest of the rooms were occupied by Classes from III to X. Peeping throgh the glass panes I could see that the Drawing Class Room was well decorated and no less decorated was the Geography Class Room, that there was also a Manual Training Room completely equipped.

As I was coming out of this school building my attention was attracted towards the Kerbala which appeared to be newly repaired, completely plastered and white-washed. At the gate of it there hang a board on which it was written "Theology Department." I went into the Karbala and was much pleased to note that its big hails were used for holding Theology classes. Adjoining the Kerbala there was a big beautifully built mosque in which it appeard, the students assembled to say their prayers.

Coming out of the Kerbala I made my way towards the Hall when my eyes fell on a big tank that was dug near the present "Nature Study Garden. It was full of clean water, but inside it there were frogs and fishes of different colour, for the use of Biology students, as I guessed.

I was about to turn my face twards the Hall when I felt as if some body was shaking me by the shoulder. I opened my eyes and saw my friend seated by my side and saying "Get up we have got to attend the English Period."

admitted that no intellect has ever surpassed that of Plato. Some arts of the past, such as tempering of copper, were lost and have never been recovered.

Then why such a rush of inventions in this century ? Why these steamships, aeroplanes, wireless telegraphy and telephones, television, electrotyping and hundreds of others have been invented in such a short time It remains a startling fact, a puzzle, a marvel; and the greatest marvel of our marvellous times.

A Vision of our College

BY

Mohammad Mir C. XI

As I sat in the reading room in my leisure period *I fell into a nap*. I dreamt a dream! Methought that I was coming to college at 10 A. M As soon as I reached the College gate, I looked up and saw that the entire aspect of things had undergone a complete change !

On the lawn lying before our present College building there stood a double-storied structure, beautifully built with verandahs on both sides. Surprised I looked about myself and noted that the wings of the College building had grown and were now reaching upto the front boundary wall Extremely curious to know what for these additions were made to the building of the College, I stepped into the verandah of the front building and there my eyes fell on a door which bore a slab on the top and "Principal" written on it. A little ahead there was another slab with "Vice Principal" on it, and *lastly* a third on which "Principal's office" was written. So it was I thought the lower storey of the new building on the lawn was occupied by the rooms of the Principal, the Vice-Principal and their office.

A stair-case in the verandah led to the upper storey which I soon reached. This was occupied by the library, as I guessed, for on both sides there were placed, racks for news-papers, and there was a small room at the end on which "librarian's office" was inscribed.

I came downstairs and went towards the right wing of the main building of the college. I found that the newly built portion was occupied by the Biology Department and consisted of two lecture rooms, two laboratories and a small room as the office of the department. I moved on and found that the boards bearing the names of school classes had completely disappeared, for the rooms on

first telegram sent; five days ago the first oil-well was opened; three days ago we first had electric light and trams; day before yesterday the first wireless message was sent and the first heavier-than-air plane flew; yesterday came the first World War; last evening at two-thirty Charles A. Lindberg flew alone across the Atlantic and at five-thirty the great business depression started; last night at eleven ten two aeroplanes made the first flight over Mount Everest.

This morning at two-twenty-three occured the Quetta earthquakes; at four the Spanish War started and at eight it ended; at five minutes past eight Hitler appropriated Czechoslovakia and began the second World War; at thirteen minutes past eight President Roosevelt sent his famous peace message to the rulers of Germany and Italy.

At nine came the 'New Triple Alliance' and the World New order; at nine-fifteen came the Italian adventure in Greece; at nine-forty-one there was menace in the Far East; at eleven-twenty-five Burma was captured by the Japanese; nine minutes ago arose internal disturbances in India and Mahatma Gandhi went to jail for the fourth time.

For ages the world has been moving slowly at an even pace, on the same path which the past generations had followed. In our times, weeks may pass without our noticing any change, but in antiquity centuries passed without a change. Out of the sixty centuries of world's authentic history, fifty-nine rolled on without any change; and then there was a great awakening and all the really great deeds of mankind have been packed up in one century.

It does not mean that the people of the past were not wise and keen-witted There has been practically no improvements in the deep philosophies of the famous Greek Philosophers, Socrates Plato and Aristotle; and the ancient Greek art could not be surpassed. But we are talking of knowledge and not of wisdom. We are emphasising discoveries, inventions and science, which add to the human comforts and make life more pleasant.

"But why all these inventions have been packed up in one century?" is a question which still remains unanswerable. It can be said that all the generations have been adding something or the other to the store of human knowledge and that it is the aggregate of it all that we are seeing and enjoying. But if it were so, people would be riding on steam-trains in the begining of the Christian era and the vaccination for the prevention of diseases would be known by old Roman doctors. "In fact progress crawled snail-like for fifty-nine centuries, and then all of a sudden it flew like a bird."

We can also not claim to have better brains in these days. It is universally

In fact these are the outstanding shortcomings and drawbacks of Indians. It is our duty as the sons of the soil and the future citizens of our motherland to try our best to promote the educational conditions of our country and thus ameliorate conditions and make India once again the great nation that she had been.

THE GREATEST MARVEL

or

OUR MARVELLOUS TIMES.

BY

Dayal Das, XII B (Physics Society)

We have passed the time when "quick as lightning" expressed the most speedy movement. Now science can make a flash in one millionth of a second. In every sphere of life, science has worked wonders. Industry, agriculture, transportation and communication, all have been completely revolutionised by the development of modern science. It is great to be alive today.

But the greatest marvel of all is that nearly all these marvels have come within the last one hundred years, and the most amazing ones in the last decade. So much so, that it appears as if the chief achievements of mankind have been shifted down to this age, while the past scores of centuries are quite barren of achievements.

In order to make this surprising marvel clearer, let us focus the chief events at a still nearer distance by compressing the time scale. Let us suppose the six thousand years of the genuine history of the world, (ignoring the days of the hoary past) to be equal to one year. Then according to this scale, reckonning from noon today, we shall see where the chief events of history lie.—

Ten and a half months ago came the Deluge of Noah, eight months ago the Egyptian Pyramids were built, five months ago Babylon fell and Gautama and Confucius lived; four months ago Christ was born, three and a half months ago Rome fell; three months ago Mahommed was born; two months ago came the the first Muslim invasion of India; a month ago Columbus discovered America and the first book was printed from movable type.

Last week came the first balloon ascention, the first steam boats and trains, and the battle of Waterloo; six days ago the first ocean cable was laid and the

kidnapping which becomes at once an object of excitement and pleasure. But if the villages were provided with well laid out playing-grounds, there would be less of crime, dacoity and other mal-practices.

Then gambling and intoxication are much ripe in India. With some, these two have become the part and parcel of their physical existence. They cannot shake off these evils. Such people have scant means even to live from hand to mouth. They do not prosper in life. Sometimes when they do not have money enough they go on raiding expeditions and commit theft and robbery. They are a positive curse to the society. They effect the general standard of living. There are others who indulge sparingly in gambling and say that they gamble during the *Dewali.*

The purda-system has gained ground in India. It is India alone, and no other country which observes purda to such extremes. Today there is hardly any necessity of purdah in India. It is of no use. People who observe it believe that it prevents man from crushing evil thoughts and thus renders man purer and more virile. The theory falls to the ground. A thing which is kept in *Purdah* (veil) is much more tempting and attempted to be seen than that which is open to view and above board. Hidden objects are alluring things open to view will not invite so many looks. If the practice is well and good let males also observe it. Manifestly it causes diseases which are fatal. It keeps woman-hood aloof from the world, as if they have no concern with its happenings. Why should not women be given the chance of coming out and helping us in the task of the country's uplift and thus become energetic and helpful in the solution of the various problems of our country? Do not make woman-hood a burden and a halter round the necks of men.

It is an old custom of India that the widows are not re-married. The young steel guarded widows add to the number of public women in the society. They are feeble as a matter of fact to check the passions. The best course would be that young widows should at once be remarried. It is very pitiable that if a man becomes a widower, he can marry as many times as he pleases, but if a woman becomes a widow she is forced to live a life of chastity.

Next the dowery-system is a big evil in the society, There are many parents who can not marry their daughters for the simple reason that they cannot afford to give the desired amount of money to the bridegroom as dowery. In this way there are many girls of young age who are left unmarried and become a threatening menace to the name and fame of their parents. Thus poor parents are baulked in the marriages of their daughters. This system very shamefully declares that the higher the bidder the surer are his chances.

THE SOCIAL EVILS OF INDIA AND THE WAYS TO ERADICATE THEM.

BY

Jagat Narain Srivastva C XII A

The reforming of Social life in India has become an acute necessity and the problem itself is one of the burning ones, as India dreams of freedom and fairness. The various social reform-movements have contributed a lot towards bringing about a marked change in our thoughts and the changed angle of vision has brought home to us all the glaring evils in society. Among them are physical deformities of character and extreme bondage to antiquated practices. We lack initiative and suffer from a spirit of indecision owing to intellectual poverty and moral cowardice. Our social strategists have been concentrating their attention on problems of multiplity of castes, removal of untouchability, joint family system, inter-marriages, polygamy, interdivising, widow re-marriage, purchase and sale of brides, dowry-system, female-education, sati, Purda, and dignity of womanhood.

Indians mostly waste their money upon marriages and other ceremonies. They sheerly waste several hundreds of thousands. If they happen to be financially handicapped, they rush to the *sahukars* so that, at exorbitant rates of interest. Then they would hold expensive feasts, offer large doweries, and spend a lot of money on useless gold and silver ornaments. Wherein lies their utility? They would gradually wear out. On the other hand if the same had to be spent on articles of comfort *e. g.* soap, quinine and mosquito curtains, there would be less of disease and poverty and more of health and prosperity in our midst. If the same had to be spent on improved methods of agriculture or dairy-farming or poultry-farming, the investors would reap the full advantage of their investments.

One of the most significant but neglected things in India is the proper education of our girls. It goes without saying that the mother is the "light of the home" and that, "the hand that rocks the cradle is the power that rules over the world." Can we treat then slightly the education of our girls? If educated wives could be had in villages, there would be bright sanitary environments and happy homes. The villagers do not think it worth while to have play-grounds and the direct outcome of which is that the villager is confronted with the problem, as to how he should spend his evening hours. For as, "An idle brain is the devil's work-shop" the village youths getting idle and unemployed infuse into their brains the evil thoughts of cattle-stealing and girl

Intermediate classes are an anomaly in an educational system, for at some places they are part of the university and at others of High Schools.

* * * *

Science students betray a singular lack of logic for they are all the time working on strictly logical lines.

* * * *

Science Student : You talk so much about your poets and stuff but I find it means nothing .

Arts Student : You too say that you can measure the height of Mt. Everest by Trigonometrical calculations and of course no body can say it is wrong for none is going to measure the actual height by a tape.

* * * *

Business men earn their thousands and lacs, but are always in straits and always envious of clerks getting their fixed small salaries.

* * * *

A journalist is the exact opposite of an author, for the former *never* means what he says, while the latter *ever* means what he says.

* * * *

Hitler is hoping that German militarism will dominate the world when every German soldier would be wiped off.

* * * *

A doctor, an architect and a politician sat conversing together. Each claimed that his profession was the oldest.

Doctor : Eve was created out of the ribs of Adam and that must have been done by a surgical operation.

Architect : But, Heaven and earth rose out of chaos before Adam and Eve were created ?

Politician : But who created the chaos? Surely one of us.

* * * *

Quite recently they had hoisted a congress flag on top of a school. The Government orders were that the flag should be put away. The students were threatening to go on strike if the flag were touched. The school authorities were in a fix. Presently a monkey appeared on the building and tore the flag into pieces. Perhaps monkeys are the most loyal subjects of His Majesty !

Why Worry? Smile!

Communalism :—a term rather disgraceful, applied in India only to Muslims for if a Muslim favours another muslim he will be dubbed *communal*, while, if a Hindu favours another Hindu he will not be called communal.

• • • •

Professor :—a term of respect applied *only* to Head of Departments in a University, but to *every* teacher in an Inter College

• • • •

The Germans are bound to lose the War because they have won so many battles.

• • • •

The president of a certain meeting rose up, after an old lady had finished her speech, and paying a compliment to her said: "Dear lady, you are old, but not too old for me."

• • • •

The Law does not respect personalities but almost every court gives judgment in favour of the more influential of the parties.

• • • •

"Sweat of the brow" 'sweat of the brain," "sweat of the heart"—all the three phases have now become out of date, for there are teachers who earn their bread by the "sweat of their throats", lawyers, by the "sweat of their tongue" clerks by "the sweat of their figures; "executive officer by" the "sweat of their whole bodies;" business men by the "sweat of their lips," actors and nurses by the sweat of their faces;" policemen by "the sweat of their necks"; and nurses and governesses by the "sweat of their eyes".

• • • •

Scientists who have been watching the world most seriously, have come to the conclusion that it is a huge joke. Read Sir Oliver Lodge, Bertrand Russell, etc.

• • • •

Policeman stops tying the rope. The Youngman plays his flute and the other begin to dance faster.

Judge: Stop! stop! I will set you free if you stop.

The young man stops and the Judge, policeman and traveller sit down panting and exhausted.

Young man: [*Going up to traveller*]: Now tell me where you got that purse. Give it to me.

Traveller.—Do not! Do not! I stole it.

Young man:—I thought so.

Judge:—[*To police man*] then take the other one to the prison. [*police man ties traveller's hands.*] Young man is to be free.

Young man [*grimming at traveller*]: You were dancing on an unbaked water vessel my friend. Be careful next time how you slander an innocent person.

Exist Judge, Traveller and policeman.

Young man: [*Drawing out his flute and looking at it lovingly*] You have been a good friend to me today, my little flute. As long as I have with me, I shall have all the three of my wishes for no wicked person will have power over me and every one will do whatever I wish him to.

obliged to you. I just parted with all my money to a poor beggar.

Traveller: Give me back that purse. Give it, I say! [*Tries to snatch it away but the young man holds on to it firmly*] Oh! Ho! There comes the Judge and the police man [*Raising his voice and waving his arms*] help! help! [*Falls to the ground.*]

Judge: [*running up*]: What is the matter? What is the matter.

Traveller: [*in a weak voice*]: Oh protector of the poor, I have been robbed and beaten.

Judge: Is it possible! Was it this young man who did it?

Traveller. [*groaning*]: He has a flute.

Judge: Yes.

Traveller: [*with louder groans*] He is the *budmash* He stole my purse.

Youngman: What nonsense! He gave me his purse. He did not like my flute playing and gave it to stop me.

Traveller: Oh! oh! What will a goat not eat or a fool say.

Judge: Young man know this. The bolt of the door of heaven is made by covetousness *To the Policeman* Here, take this man to the prison at once

[*Police man begins trying young man's hands with a rope*]

Traveller: [*getting up says sneeringly*] The wicked bull goes at last to the shop of the shoe-maker.

Young man: [*to the Traveller*]: You can not defame me when I am innocent. The mud sticks not to the smooth back of a pankhal fish [*Turning to the Judge*]: Sir, if I must go to prison grant me one wish.

Judge: That depends. Remember you are not free now. You are a scorpion under a shoe.

Young man: I only want to play my flute once more.

Traveller: [screaming]: No! No! Do not let! Do not let him!

Judge: [*surprised*]: Why, I see no objection.—Let him have this fun.



Youngman:—Why, surely. What do I want with money. Take it.

[*Gives it to the old man.*]

Old man:—Oh, a giver is like a coconut, hard without, good within; a miser is like a bamboo, hard without, but hollow within. Since you have been so kind and generous I will grant you three wishes one for each pice. What shall they be?

Young man:—Three wishes! Ah! First, I wish that I may have a flute that will make every body dance whenever I play on it. Second, that no wicked person may have power over me; and third, every one will do whatever I wish him to.

Old man: [*rising*]: These are simple wishes enough. Live contented, and you will be a king.
[*Talking a flute out of his pocket.*]
Here is the flute and with it I give the other two wishes.

Young man : [*making a Salam.*] Thanks.

Old man :—[*Returning to Salaam*] Peace be with you.
[*Exit old man. Enter traveller*] **Young man** *begins to play the flute. Traveller begins to dance, slowly then faster and faster to the music of the flute.*



Traveller—Stop! Stop! I do not want to dance. Any more.

Young man: [*Still playing*] Stop yourself.

Traveller : Stop! Stop! I am all out of breath.

Young man : [*still goes on playing*]

Traveller : [*Still dancing*]: If you only stop I will give you my purse full of gold.

Young man : Well, that is kind of you. It is a pity to stop when you dance so beautifully. But since you wish it [*puts the flute in the pocket*] and since I may have your purse. [*Puts out his hand and takes the purse.*] Thanks. [*Making a Salaam.*] I am really much

that the mountain bears on its back, but the mountain moves not, still as firm-footed as ever.



Characters:—The little old man. The traveller. The Judge. The policeman.

Enter a Youngman *Singing Tra la-la* [Takes three new copper pice from his pocket and looks at them]

Little old man.—[*Sitting by the side of road*] Good morning, young man. You seem as happy as a Child to-day.

Youngman:—Why, yes, why should not? I have not a care in the world. I am light-hearted as those monkeys gambolling on the tree-tops, there. I'm out to seek my fortune, with plenty of money and nothing to do but what I want to.

Oldman:—How much money have you?

Youngman:—Three bright pice, fresh from the mint. See how shining they are.

Oldman:—Oh! young man, have pity on one who is the poorest beggar by the road-side. You can easily work for more.



The two are psychologically opposed to each other. The modern world with its sick hurry and divided aims and pressure of responsibilities and cares, has given rise to two distinct types, one including persons that believe in making 'a head against a sea of troubles and by opposing end them,' the other comprising persons who believe in suffering to the extreme end and waiting for what fate has in store for them. Hitler belongs to the first type as Churchill belongs to the second. Now every one must have noted that first type of persons are always nervous at the coolness and calmness of the persons of the second type, and so Hitler's agitated nerves—lose all control at the haunting presence of a calm person who inspite of repeated losses in battles continues to say that "the central direction of the war has not failed."

The difference between these two personalities that are shaping the distinies of the world today is also the difference between their nationalities, for both are true representatives of their nation. Hitler is like Geothe's Faust who has sold his soul to the devil in exchange tor the enjoyments of the world and who therefore tries to make the most of all the enjoyments of the world as hurriedly as possible, afraid that death may pounce upon him and he hand his soul over to the devil to live for ever in the darkest hell. Churchill is like Shakespear's Falstaff who brings an army of men in rags for recruitment and on being questioned replies that they can fill the pit as well as the better ones and who at the time when the greatest misfortune befalls, *i. e.* When his friend Prince Henry now King Henry the fifth looks at him not, he turns to his creditor whom he had so far kept up with hopes of getting immense money from King Henry, and calmly says: "Master Shallow, I owe you a thousand pound," A Faust must at once have given his soul to the devil without delay at the heaving the above words from a careless and 'fatty' fellow who had had all enjoyments of the world without giving his soul to any body. Hitler is afraid of Churchill as Faust would have been afraid of Falstaff.

Lastly Hitler fears Churchill just as an idealist is afraid of a realist. An idealist is one who hates all opposition in the attainment of an object which lies at a distant un-attainable, strikes his head against a mountain in order to make the mountain yield up its wealth. A realist stands firmly at his own place, has no object in view, he wants to gain only the thing over which he come at in a sure leap. He is sure and steady and this sureness and steadiness is cause of extreme nervousness to the idealist who away from his own home is distracted at following after a jack o' the lantern who recedes farther and farther away from him. Hitler is like lightening that flashes and thunders and falls, burning to ashes all on which it falls. Churchill is like a mountain that rears its peak high up into the air, has yet its base firmly planted in the earth and the lightening burns the forests

(5) Inulase :—It helps in changing the inulin into Sugar.

(6) Pepsin:—It changes proteins into Peptones.

(7) Trypsin :—Transforms protericts directly into amir s-acrets."

(8) Erepsin :—Transforms peptores into amino—acides.

(9) Lipase :—This exzyme breaks up fats into fatty acids and glycerine.

(10) Diastese :—This enzyme is of very great importance which is used in the conversion of starch into meltose and gluecose Starch is mixed intothe yeast and the temperature is maintained at about [illegible] C. The conversion is a hydrolitic action, as represented by the following equaties.

$$2(C_6H_{10}O_5)x + xH_2O \text{ --- } [illegible]$$

[illegible]

The process is known as ***marking*** and the product as *[illegible] or [illegible]*.

Starch is converted into sugar (glucose) by means of hot, dilute Sulpheric acid or hydrochloric acid.

$$(C_6H_{10}O_5)x + xH_2O \text{ — } [illegible]$$

Starch [illegible]

HITLER FEARS CHURCHILL

BY

Asrar-ul-lah C. XII B

Churchill is the man of whom Hitler is afraid! Yes! Adolf Hitler, the *Fuhrer* of Germany, the conquerer of entire Europe, whose armed might struck terror in the hearts of such highly equipped soldiers as the French, is afraid—terribly afraid of Mr. Winston Churchill the prime minister of England. Yes, so afraid Hitler is that at the fall of France the main clause of his peace offer was that Churchill should be removed from Prime Ministership and then he would have no quarrel with Britain or the British Empire. That the offer was rejected by the British people made him still more afraid for he saw that the British people were at the back of Mr. Churchill. Still his 'fear complex' against Churchill reveals itself in every speech that he made and also in every news-broadcast from Berlin, where one too often hears denunciations of Churchill and his Labour Party.

But the question arises why should Hitler be afraid of Churchill? The answer to this question can be inferred from the psychology of the two persons.

enzyme is a lifeless, unorganised, amorphous, nitrogenous material of unknown composition. Enzymes are digestive agents secreted by the protoplasm. They act upon insoluble and complex food stuff and other bodies and render them soluble. They also act upon soluble substances aud break them into simpler compounds. They are soluble in water at ordinary temperature. They are not directly formed by the potoplasm. Firstly the potoplasms are converted into minute granules known as *Zymogen.* The zymogen is then converted into enzyme for instance, enzyme pepsin—is formed from pepsinogen and enzyme trypsin from trypsinogen. Here Pepsin and trypsin are the enzymes and pepsinogen and trypsinogen are the zymogens.

In experiments the enzyme acts merely as a catalytic agent. Enzyme are of many kinds. Different enzyme have got different action on different substances. The enzyme which act on starch will not act on sugar. Or any other sbstance. This is expressed as 'lock and key' action. But is a general rule that enzymes can act on more than one substance and there are substances which are acted on by more than one enzyme. The enzyme is never exhausted. A small quantity of it can work for a long time on an unlimited supply of the substance. The enzyme induces some chemical action in the substance without itself undergoing any change. Therefore the enzymes are regarded as a catalytic agent.

The Erzymes are very sensitive to temperature. The action of enzyme ceases if the temperature. is raised near about 70°C The temperature at which, they are most active lies in between 25°C and 35°C. Different kind of enzyme and their action on different substances are given below :—

(1) Invertase :—This enzyme converts sugar into glucose and fructose. The reaction is a kind of hydrolysis, *i. e.*, a molecule of water is added to sugar:—

$$\underset{\text{Sucrose}}{C_{12}H_{22}O_{11}} + H_2O \longrightarrow \underset{\text{Glucose}}{C_6H_{12}O_6} + \underset{\text{Fructose.}}{C_6H_{12}O_6}$$

(2) Maltose :—This brings about the hydrolysis of maltose and onverts it into glucose:—

$$C_{12}H_{22}O_{11} + H_2O \longrightarrow 2\ C_6H_{12}O_6$$

(3) Zymase:—This exzyme helps glvcose 4 Alcoholic fermentation. The prinipal chemical change, which occurs during alcoholic termentation, is the change of glucose into alcohol (Ethyl Alcohol.)

$$\underset{\text{Glucose}}{C_6H_{12}O_6} \longrightarrow \underset{\text{Alcohols}}{2C_6H_6O} + \underset{\text{Carfrondioxide}}{2CO_2}$$

(4) Cytase:—This enzyme converts cellulose into a kind of sugar.

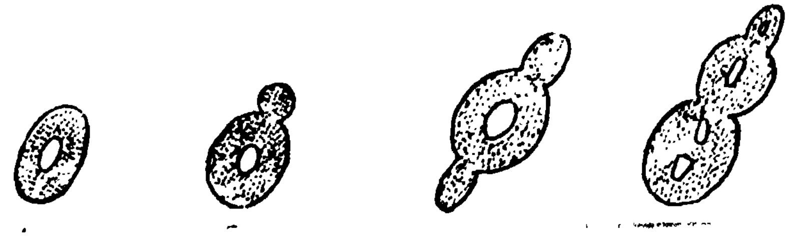
and winegar, rotting of wood and vegetables and purification of meat are some of the examples of fermentation. In chemical terms fermentation is the change of sugar solution into alcohol and carbone-dioxids brought about by certain micro-organism in the absence of oxygen.

The frathing of grape sugar or toddy is due to the evolution of carbon dioxide gas; Sugar is entirely broken up by unicellular yeast plants into alcohol and carbon-dioxide.

Pasteur was the first man to carry out an experiment on fermentation. Later Liebig found out that the phenomenon was purely of a chemical nature. Buchner after a great deal of hardship and labour was able to understand the phenomenon. He submitted yeast to strong pressure and obtained a certain kind of juice. This juice was found to set up fermentation like the living yeast cells. The extract is called by the name as *Zymase*. He concluded that fermentation is a chemical process but a process different from usual organic chemical reactions.

Any other name of the yeast is Saccaromyces. This is found abundently in toddy, in the soil of the wine yard and in grapes. It was first examined with a microscope by Leeumenhock in the year 1680. Its true nature was discovered by Schwann in Germany in 1836. Its structure is very simple. A single microscopic cell represents the whole *boety* of the plant. Each cell is oval or spherical, provided with a distinct cell wall, and contains a granular *man* of protoplasm and a single nucles which is not very distinct.

The Yeast during the experiment increases in size by the process of budding. In this the cell forms an out growth which is ultimately cut off from the mother cell. This process of cell formation is known as Budding. Budding may continue one after the other, in a series, so that the new outgrowths appear like heads in chain as given in figure.



1 2 3 4

1. year cell. 2, 3, 4 show Budding and so on

The action of yeast is due to certain *enzyme* present in the cell. Fermentation is brought about by the juice of cell. in the absence of living organism. An

individual benefit. Still Russia had never anticipated the unexpected German attack and so could never successfully counter-attack the mechanized *pansers* of Von Bock and Runsdet. After more than a year's hard fighting Russia seemed to be loosing ground. Germans have already taken the most fertile and rich parts of Ukraine and some parts of *SPICA*. There was a strong rumour from Ankara radio that Russia is going to conclude a separate peace-treaty. Such a humiliation from a man like Joseph Stalin seemed apparently absurd. He would everytime prefer death over a vanquished treaty. Churchill's hasty visit confirmed the news of Russia's determined stand whatever may be the consequences. Great was the enthusiasm both in Russia and England when the two great leaders met. The details of war, the tactics of the enemy, the supply problems of the Allies and last of all the problem of creating a second front in Europe, might have been discussed.

Nothing was revealed of the eventful meeting. The press remained calm simply telling that "it was successful." The speculations ran high, about the next offensive of the Allies. Churchill's visit to Moscow followed by his visit to Egypt, surely indicates that much depends on the Libyan campaign and something eventful is going to happen there. Great military changes made the matters more complicated. The 'Auk' has been replaced by General Alexander and Maitland has been sent to take over the charge of Iraq and Iran, which is getting increasingly important with the German advance towards the Caucasus.

Germany is inciting Japan to attack Russia and have a walk-over victory. It is just possible that the British offensive in Burma begins as Soon as Japan attacks Russia in Manchuria to minimise the brunt of Japanese attack. Some strategists also suggest the opening of a second front in Caucasia through Iran against the German on-slaught. America has already taken a new offensive in the Solomon Islands to keep the Japs busy in the Pacific and never become powerful to interfere in the European politics. While the position of the Allies in Libya has greatly improved, Rommel has been forced to halt at Alamein. Certainly we may expect great events in every corner of the world as the War Wheel is moving faster than ever.

FERMENTATION.

BY

Sant Prasad Singh, C. XII Sc.

Fermentation is the process by virtue of which a liquid begins to boil without raising its temperature. Souring of milk and kneaded flour, production of Wine

Lest other boys should do the same
And should not live to tell the tale —

I screen from you all that occoured
For I myself don't know the rest ;
I dream't they said the beng was heard
From Debra-Dun to Budapest.

Next day found me alive in bed
But that night has made me so -,
Thus I don't warm when I do add
Even H_2O to H_2O

WHAT ABOUT THE WAR?

Minhaj-ud-din Ahmad B. A. (Hon.)
Ex student

The flying visit of the head of the Imperialist Britain to Moscow is by no means surprising The two great men of their times Mr. Churchill and Joseph Stalin had long ago decided to sink their differences and fight the common enemy—the Nazi Germany, under the Dictatorship of Hitler.

This War is often interpreted as the people's war. It may be called people's war only because socialist Russia has joined on the side of the Allies. Since the 18th century wars in Europe are being waged to keep up the balance of power. Napoleon and Kaiser both launched their all-scale attacks against Britain to prevent her from becoming all powerful and to carve out territorial and commercial jurisdictions for themselves. Both failed and became weaker, consequently leaving Britain more powerful and more Imperialised. But a fully nationalised state is bound to re-attack as soon as she becomes strong, and so did Germany under Hitler.

The war took almost a new turn as soon as Germany attacked Russia, the only representative of the doctrinal spirits of the people of the whole world. The anti-social, anti-economical and anti-moral struggle all in one was launched against Bolshivism.

Hitler miscalculated the strength of Russia, and he utterly failed in acheiving his much-boasted object, or we may say that Russia formed a national front. It was at once the people's war and the national spirit of the people can never be conquered. Everyman in Russia is fighting for his own existence and for his

that should be above all sentiments, and this power we have in what we call the Will. Will is nothing but our whole self the self—sentiment in its strength, that stand a monarch in the midst of our sentiments. It is the governor and upon its strength will depend the strength of our personality. It is the presence of a strong Will that gives us a personality.

THE FATE OF MR. CHEMIST.

BY

Akbar Husain Siddiqi.

One night I added in my sleep
Some X to Y and warmed
And woke up, sweating queer and weak
And nervous, tired and worn.

I knew I had been given free
A list to guard against mistakes,
That in the 'lab' of Chemistry
The careless chemist often makes—

For each seperate sheet is there
Whereon the thoughtful youth may find
A list of things he must'nt dare
And other hints to bear in mind—

But I did hold that laws were made,
Inspite of things that we must care,
On purpose to be disobeyed ;
And I did all one mus'nt dare.

I wasted gas like anythings
And ran the taps of H_2O.
I made the Bunsen burners "SING"
And water leak through down below.

I dream't of dangerous experiments
From half-past ten to dawn
All done by me at College expense
They made me weak and worn.

Until I had myself to blame
For what occured to me when I
To earn a research scholars fame
Warmed X with concentrated Y.

I fear to give the proper name
For at home on a small scale,

As a boy grows up to manhood a number of such sentiments are formed in his mind and corresponding to them a number of habits acquired. But besides the instinctive tendency which is the main spring of all mental develapments, the moral tone of the environment in which the boy is brought up gives a colour or a tinge to his sentiments. He has sentiments of hate towards certain things and of love towards certain others; a European hates polygamy which is regarded as a mere matter of course among us Indians; but young Indians who have embibed European sentiments grow to hate polygamy. Thus a young man has certain likes and dislikes and these are based a good deal upon the likes and dislikes of the group, the community, the family to which he belongs. We see that children coming to school from "low classes" of society have no hate of slovenliness in talk, in dress, or in behaviour, while the children from the "higher classes" at once spot them, grow to hate them and always refer to them as "low type."

A man's character is nothing but his habits and sentiments looked at collectively. But sentiments as they stand in a character are bound to be too numerous and aften conflicting with one another. Hence there is the necessity of an organisation. A character will not show distinctive qualities unless there is some sort of an organisation or arrangement under the principle of superiority, inferority and equality, in the various sentiment that compose it. But the question is which sentiment should be given the absolute supremacy ? McDougall answer that such a sentiment can be found in the self-sentiment or the "self regarding sentiment" which he therefore terms "the master sentiment." All our sentiments must be brought under the subjection of this sentiment. Our character will be strong or weak in so far as this mastery of self sentiment over other sentiments, is strong or weak. A man of personality is one who has got a well integrated character.

As expressed above the process of forming a personality appears to be simple enough and may lead us to the conclusion that every man is a man of personality while in fact the real case is the reverse. In practice the formation of personality is not an easy process. It requires a thorough and impartial search on the part of the individual into his sentiments, a discarding of all those habits and sentiments that hang loose and would not harmonise with his self sentiment, and lastly a resolution of the conflict that might exist between sentiments and sentiments in proper and peaceful manner as far as possible. We must pay the greatest heed to the peaceful settlement of the conflict between two opposed sentiments, for if we repress one at the cost of the other the result, it has been found, will be very bad and is likely to lead to abnormal conditions, that is a functional disorder of the brain. But in order to do this at all or to take any of the other steps towards forming our personality, we require a power within us

power'—that literature is a power and it imparts to us a peculiar power, a power that cannot be easily defined but it comes to form a part of ourselves and our personalities, changes our outlook on life, enables us to look at things differently from other people, and makes us feel a peculiar exaltation, a pleasure, the pleasure which is the essence of life itself. The ultimate goal of all our efforts, as has been agreed upon all hands, is the attainment of a 'paradise'. Literature gives us a paradise on Earth.

PERSONALITY.

BY

AHSAN

Generally we refer to a man of good physique and handsome figure as a personality. But personality consists in something more than the outward equipment of a person, for it principally take into account the inward or the mental equipment of a being. Psychology tells us that a human being is "a mass of tendencies to act, to feel, and to know." Some of these tendencies are *instinctive* that is inborn or inherited from the ancestors or the race, but as the person grows up, his mind also grows and these in-born tendencies are transformed into what are called *habits* or *sentiments*. These latter are called secondary tendencies as opposed to the former which are primary ones.

Without going into the details of psychology it will be quite plain that habits and sentiments mean the same thing. They are just the two sides of a coin, for habits are formed in the service of sentiments which, in turn, have developed from the instincts. An example will make it clear how an instinct develops into a sentiment or habit. A young boy, say of five or six years of age, shows a tendency towards self-assertion. In his play with other children of the same age, he tries to look prominent by running ahead of them in a race or by other means. The boy is sent to school where he meets children of his own age many of them superior to him in almost all the activities of school life. He, for some time, feels simply non-plussed. But his instinct to assert himself is all the time impelling him to gain ground over his fellows. He tries to come at the top in games, in arithmetic, in social work etc., but he fails in all these. At last he comes to realise that in reading and writing he can be superior to every body. From now on a sentiment round reading and writing begins to be formed and a habit of reading and writing grows in the boy, so that when he reaches maturity he is regarded as a voracious reader and a conscientious writer, and is distinguished from his fellows as the "man of letters" or the "man of taste."

has over-burdened his poetry with a moral purpose. Tolstoy is another great advocate of morality behind literature and he condemns Shakespeare for lacking it. But the view held by Tolstoy about lack of moral earnestness in Shakespeare is only partially justified. Contemplate any of the heroines of Shakespeare. Miranda, in the *Tempest*, is a unique creation. This pure and innocent child of nature stands unparalled in her innocence, simplicity and loveliness. She is Nature's child unsoiled by civilization. 'She is the Eve of an enchanted paradise'. Ophelia is so innocent, so child-like that we wonder at the fate that overtakes her. She is too good, too sweet, too fair to be cast among the briars of this work-a-day world and fall and bleed upon the thorns of life. The sanctity of her love which she never once confesses openly is great. In the character of Portia Shakespeare gives us a faithful portraiture of a noble Roman matron. Brutus' stoic firmness is reflected in her. Her moral courage, love for her husband, and her lovable nature bear testimony to her purity and morality. Can any one doubt that these heroines are not models of moral virtue. Even his heroes are morally great. If they fall, they do fall only on account of some moral flaw in them. Besides, there are such poets as Milton in whom poetry and morality are so harmoniously blended that it is difficult to know the one from the other.

Opposed to those who only emphasize the moral value of literature there is the 'art for art's sake' school, which lays stress upon the value of art itself. If poetic value lies in the stimulation of religious feelings, "Lead, kindly light," is no better a poem than "many a tasteless version of a Psalm." There is plenty of connection between life and poetry but it is a connection not so much obvious as hidden. They are parallel developments which nowhere meet, and hence we understand one by the help of the other. 'Poetry is neither life nor, strictly speaking, a copy of it.' But no doubt, the particular reason why poetry has poetic value for us, is that it presents to us in its own way something which we meet in another form in life. It is on the basis of this conception that Matthew Arnold says—'Literature is the criticism of life'. It is exactly so. Criticism of life will teach us to live and there is no doubt that students of literature can understand human values much better than students of Science, Physics, or Chemistry.

It was some such view as the above that made Matthew Arnold prophesy high destinies for poetry and literature, and made him say that as time would go on, in poetry, humanity will find greater and greater and surer and surer stay. But the question arises what is it in the various 'pieces' that can justify this prophetic exaltation of literature above all other forms of knowledge? The fact is—as De' Quincy says: 'There is a literature of knowledge and a literature of

But will keep April moistre in their heart.
May's music in their ears. Their voice revives.
Revives, reju anates wintry world,
Flushes the veins gnarled and knotted age,
And crowns the majesty of life with leaves
As green as are the sapling

—*Alfred Austin.*

War has victims beyond the hand
Borded to slaughter, war moves armoured wheel
Accross the quivering flesh and patient limbs.
Of all life's liable friend.

— *Herbert Read.*

UTILITY OF LITERATURE

S. Mohammad Ahmad Zaidi, M. A. Pt. I. (Eng)
Lucknow University,
Ex-student.

Literature cannot be useful in the same sense as Physics, Chemistry or other useful Sciences and Arts. It is generally thought by some people that literature can be useful because by studying it we can learn to write and sell our articles, but properly speaking this is an external use imposed upon literature. Even Hazlitt saw little use beyond the acquisition of a power to write in the study of classical authors. But Hazlitt has his own peculiar way of putting things. Otherwise a true poet or writer does not write for money but for the pleasure and satisfaction of his own inward craving.

Poetry may also have an ulterior value as a means to culture or propagation of religion, because every piece of good poetry conveys instruction, softens and subdues the human emotions or furthers a good cause, because the poet being a maker, makes things after life, and if the ruling principle of the world is essentially moral, the copies of them drawn by the poet are bound to inspire us to virtue. Literature no doubt is useful in these respects also, but its ulterior worth 'neither is, nor can directly determine its poetic worth, as satisfying imaginative experience, and this is to be judged entirely from within. The consideration of these ulterior ends, whether by the poet himself in the act of composing or by the reader in the act of experiencing, tends to lower down poetic value. It thus changes the nature of poetry and throws it into a different atmosphere.

It will be going too far to say that literature is a school of morals, that is, the chief utility of literature lies in the fact that it teaches morality. Spenser

"Take into the air my quite breath
Now more than ever seems [illegible] die
[illegible] cease upon [illegible] with [illegible]

Othello, when he meets Desdemona after the tempestuous tumult of the waves, was over heels and shoes in joy and at that raptured moment, he uttered invoking death—

"If it were now to die, it were now to be most happy, for I fear, my soul hath her content so absolute, that another comfort like this succeeds not in unknown fate "

Some people are extremely terrified by the mere mention of 'Death' and the old pardons, with wrinckles on their forehead and furrows in their cheeks, and with 'clear experience' sunken in their eyes' are scared away by the horrible aspect of death. They would like to cringe and servile before the haughty command of this 'crown of life' and he at last takes to "the undiscovered country from whose bourne, no traveller returns" For these people who are panic-stricken at the vision of Death, Epicureous proposed a very interesting dilemma, which helped them in to palliate the anguish at the idea of Death. 'When you are, death is not; and when Death is, you are not, and therefore there appears no plausible reason to FEAR DEATH.' But the most valiant and meritorios way of meeting Death is that which Browning describes in prespice —

"Fear [illegible]
[illegible]
I [illegible] death bandage [illegible] eyes, and fore bore
[illegible] creep past
[illegible] taste the whole [illegible], fare like my peers,
[illegible]"

Some people are otherwise and take too much interest in their own lives. They are selfish, and alterism seems not to be in their nature. They hesitate to undertake any responsibility for other people, and sacrifice their lives for some noble cause and for their country. Such people are ignominous, craven and bedim the glory of human soul It is commendable to meet death in a noble cause, so that the spirit of Man may rest in idyllic tranquility in Elyseum, and his name be immortalised in the annals of his country. Such a death is glory in itself, and leaves a landmark in the life history of the man. The persons who meet Death in such exalted and dignified manner are the heroes of posterity and the objects of admiration of the contemporaries.

The favured of the Gods die young for they,
They grow not old with grief and deadening time,

death ?"—What seems so is transition."—Montogomery similarly asserts—"The soul, immortal as its sire, shall never die." Addison in defence of the same position writes :—

"The soul, secure in her existence, smiles,
At the drawn dagger, and defies its point.
The stars shall fade away, the sun himself
Grow dim with age, and nature sink in years
But Thou shalt flourish in immortal youth,
Unhurt amidst the war of Elements
The wrecks of matter, and the crush of world."

- *Addison*

Keats, and Tennyson visualise two objects which seem to escape Death. To Keats it is the Nightingale. In the "Ode to Nightangle" he says :—

"Thou wast not born for Death, immortal bird
No hungry generation tread thee down,"

He thinks that the nightingale pouring melody in his ears will remain for ever. Similarly Tennyson makes his Brook immortal—

"Men may come and men may go
But I go on for ever,"

It is difficult to say how for those poets have the truth on their Side, but it is certain that thev believed in the immortatity of these two objects.

Inspite of tremenduous destructions wrought by Death, it has not been detested and held in contempt by common men and poets alike. They sing hymns of praise to Death, and invoke it whenever they are at the height of beautitude or when they are tormented by agonies and the stern, solid realities of the world. The poets do not pronounce their imforecations upon its destructive nature but they hail it as the deliverer of human cares. Burns in " Man was made to mourn' says:—

"O Death ! the poor Man's dearest friend
The kindest and the best."

Another poet strikes the same note in these lines—

"Come, gentle Death, the ebb of care
The ebb of care, the Flood of Life."

Keats in his "Ode to a Nightingale" mentions "DEATH" and wishes to die, when he is at the height of enjcyment and has forgotten himself in the melodious strains of the Nightingle. He sincerely wishes that death may :—

Let us alone. ....

All things are taken from us and become

Portions and parcels of the dreadful Past:

All things have rest and ripen towards the grave."

Tennyson

Shakespeare; the lawless genius, asserts the same truth in the 'Tempest'.—

" The cloud-capp'd towers, the georgeous palaces,

The solemn temples, the great globe itself,

Yea! all which it inherits shall dissolve

And like this unsubstantial pageant faded

Leave not a rack behind."

Shakespeare

And in one of his sonnets he says:—

" Since brass nor stone nor earth nor boundless sea

But sad mortality o'ersways their power

How with this rage shall beauty hold a plea?

Whose action is no stronger than a flower."

—*Shakespeare*

Shirly in the 'Contention of Ajax and and Ulyses,' sings the same song but in a different tune, emphasising the omnipotence of Death:—

" The glories of our blood and State

Are shadows, not substantial things.

There is no armour against fate,

Death lays his icy hand on Kings.

Sceptre and crown

Must tumble down

And in the dust be equal made

With the poor crooked scythe and spade.

—*Shirly.*

All these quotations need not establish that every thing is mortal and falls a prey to the supreme power of Death. There still remains something which Death cannot touch, and it is the "IMMORTAL SOUL" The holy Gita says, "He is not born nor doth he die nor having been, doth he ever cease to be, unborn, unchangeable, eternal and ancient, he is not slain when a body is cut" The immunity of soul, from the power of Death, is expressed by Longfellow:—

"And in the wreck of noble lives

Something immortal still survives,"

— *Longfellow.*

And in "Resignation" the same poet avers emphatically, "There is no

'DEATH' IN LITERATURE.

BY

Akbar Hasan Siddiqi, XI B

"How wonderful is Death, Death and his brother sleep! One is pale as yonder waning moon with lips of lurid blue, the other rosy as the morn when throned on oceans waves it blushes over the world: Yet both so passing wonderful." Man stares at it with wonder and awe. For, it is his most implacable arch-enemy, who defies his power and can never be routed in the hot struggle after supremacy in life. Hardly does the man complete the normal span of life when Death pounces upon him like a beast of prey and makes an end of all his plantagenet ambitions, budding hopes and rousing desires. At one time or other every object in nature dies. None can hoodwink death and escape mortality. 'One thing is certain that life flies, one thing is certain, and the rest is lies, that the flower that once has blown for ever dies! Hamlet boldly asserts. "Thou knowest 'tis common, all that live must die', and in one of his soliloquies, he declaims in a mood of despondency "Oh, that this too solid flesh would thaw, melt and resolve itself into a dew". Macauly expresses this trite truism when he says:—

'To every object in Nature
Death cometh Soon or Late"

Hence victorious men of earth, no more proclaim how wide your empires are; though you bind on every shore, and your triumphs reach as far as night or day. Yet you, proud monarchs, must obey and mingle with forgotten ashes when death calls you to the crowd of common men. All literary geniuses have almost thought alike on the destructive power of *death*, and at many places in their literary works one finds hymns written to the absorbing power of Death. Gray in his Elegy written in a country churchyard speaks of the destructive power of Death:—

"The boast of heraldry, the promp of power,
And all that beauty, all that wealth e'er gave
Awaits like the inevitable hour—
The paths of glory lead but to the grave"

—*Gray.*

Lord Tennyson sings, the same tune—

"Death is the end of life; ah why
Should life labour be?
Let us alone. Time driveth onward fast,
And in a little time our lips are dumb

wealth and it is not purely a science of wealth as understood and defined by earlier writers on economics.

Professor Marshall has defined economics as follows: "It is the study of man's actions in the ordinary business of life." And Prof. Pigou says —"Economics is the science of material welfare," where by material welfare is meant the satisfaction or happiness derived from the possession or enjoyment of wealth.

Thus in short, we can say that Economics is not merely the study of wealth, but of man in relation to wealth.

ALL WAS QUIET.

BY

Dayal Das C. XII B.

She was sitting by the side of the river, in the lonely jungle,
with the dead body of her only son in her lap.
She heaved not a sigh; nor a tear dropped from her eyes.
And all was quiet.

Suddenly she stood up and threw the body of her son
in the river
There was a splash, an agitation in the water
But soon the sound died in the jungle,
And all was quiet

She stood for a while, gazing at the river which was
flowing smoothly again
Then all of a sudden, she shrieked and fell on the bank
of the river.
The shriek went to the foot of the hill and came back.
And again all was quiet.
She was for ever quiet.

WHAT IS ECONOMICS ?

BY

S Abdul Mohit, XII arts

If we look around us in this world we find that we all have certain wants or desires which should be satisfied: when we feel hungry we want food; when we feel thirsty we want water; when it rains or dust storms come, we want shelter; when we have to educate children, we want books and teachers; when we fall ill, we want cure etc. And similarly, we want pictures, musical instruments, means of conveyance, munitions of war etc.

In order that we may live in this world, we have to make efforts to satisfy the wants, and every one of us in daily life is making these efforts in some form or other.

Men, women and children work in the fields from morning till evening; labourers work in the factory for long hours; shopkeepers sit in their shops from early morning till late in the evening, railway servants, actors and watchmen work even during the night; doctors attend to their patients at all hours, lawyers are willing to do any kind of work for their clients and students go on working hard at their books. They are either trying to earn or preparing themselves to earn money, so that with the help of that money they may get things to satisfy their wants. All these activities of man-kind are known as economic activities as all those things that satisfy the wants and are obtained by efforts, are known as economic goods (ie. wealth).

Now all the activities of man do not fall within the province of Economics. Economics concerns itself only with one's economised activities. By economic activities are meant those human activities that are directed towards the creation, appropriation and accumulation of wealth.

A tourist who climbs a mountain merely to enjoy the beauties of nature is not engaged in an economic activity, but the activity of the guide accompanying him is economic, because he climbs in expectation of some reward. A musician who sings for pleasure is not engaged in an economic activity but the activity of one who sings for a reward is economic. Economics considers man-kind as occupied solely in the making, exchanging, sharing and using of wealth. It must be emphasised, however, that economics is a social science. That is, it deals with man in his relation to society.

Thus, economics may be defined as a social science which deals with wealth-getting and wealth-using activities of man. Economics studies both man and

In our hearts of hearts believing
Victory crowns the Just
And that braggarts must
Surely bite the dust,
March we to the field ungrieving
In our hearts of hearts believing
Victory crowns the Just

Hardy is known as emphatically the great pessimist, and none of his great novels (with the single exception of *Far from the Madding Crowd*) ends happily; *Jude the Obscure* remains the most painful of all novels in literature. His lyrics too are full of gloom, melodramatic gloom at times. But this little song is an exception and a glaring one in the entire bulk of Hardy's work. It persuades us to believe that behind all his "sinister mockery", behind all his "destructive principle in nature," behind all his "impishness of circumstance" there lay suppressed a simple faith of a soldier fighting for the Good and for its success over Evil.

This song moves us by its truth and piercingness. The grave, even, slow, and at times bald music of Hardy's lyrics comes to perform here the duty for which it is peculiarly fit. The marching of a regular army of trained soldiers does not, by the sounds associated with it, give rise to emotions of beauty, yet there can be no doubt that a battalion of soldiers beating drums, marching onward, produces a musical and inspiring noise and has often helped in gaining more recruits from among the rabble than rhetorical speeches or offerings of money. There is always a suggestion of something noble, something deadly serious, of a passion kept thoroughly under control and directed towards a noble goal, in the martial music of an advancing battalion. It is the music that constantly strikes the ears of the soldier and keeps him alert through his marches over plains and hills through his struggles against odds. It is this music that Hardy has so successfully reproduced in this poem. The first line gives a start, the next three lines with their short length and uniform rhymes suggest the soldier on the march and transport our minds to the limits of a passionate inspiration due to a noble cause; in the fifth and the sixth lines the strain is varied with such a subtle power as to remain the same though varied; and in the last line there is a suggestion not of a close but a continued march onward, and the rhythm of individual lines as well as the uniformity of rhymes corresponds to the "left right—left right" of soldiers. The regular stanza is like an armed division, equipped and regular. The movement of verses, not hurried and not slow, suggest the march of armed divisions and the contant refrain of the song—the effect of repitition—comes to our ears like the beating of trumpets and blowing of bugles of an advancing army flinging a spirit of defiance towards the enemy hosts and infusing a spirit of moral confidence in the hearts of the soldiers.

Nay, We will see what we are doing
Though some may not see—
Dalliard as they be—
England's need are we
Her distress would leave us rueing
Nay. We wil' see what we are doing,
Though some may not see!

In our hearts of hearts believing
Victory crowns the just
And the braggart must
Surely bite the dust,
March we to the fields ungrieving
In our hearts of hearts believing
Victory crowns the just.

Hence the faith and fire within us
Men who march away
Ere the barn cocks say,
Night is growing gray,
Leaving all that here can win us
Hence the faith and the within us
Men who march away.

It is an inspired song and most certainly an inspiring one. It is a simple song of an honest soldier—a soldier with a faith and fire within him, believing in fighting with his heart and soul for a noble cause, believing not simply in "Might is right" but in the eternal success of Good over Evil—a soldier who is leaving behind all that could win him, love of home and children, peace and contentment, a life free from danger of being shot through any moment, and is rushing forward to court death in order that justice should triumph and the braggart be brought down to bite the dust. As we read the poem, we do not rest content with the particular struggle of a particular soldier in a particular battle or war, but are transported into the realm of the Universal where the battle of life is raging fierce and we stand at our posts, ready to rush forward and do our share of the fighting as best as we can Life has often been called a field of battle and victory, it is said, has always crowned the best fighter. But who is the best fighter? The one who has a faith and fire within him—faith not in the success of superior resources or better organised army, not in man-power, tank-power or air-power, but in the eternal victory of Good over Evil, Justice over Injustice the faith with which all the 'armies of God' went to fight—faith inspired by which all the martyrs suffered heroically and none so much as the Prince of Martyrs Imam Husain himself. This poem is a source of constant inspiration for us strugglers against the forces of evil that are every moment trying to upset us. It warms us to our tasks and in our every-day undertakings, in every work that we take up, the eternal music of the stanza rings in our ears;

diction are the common features and make his works an object of interest and the focus of attention. All his writings proclaim his genius and marvellous intellect and supply the mental food for the readers. We are bound to shed tears when we remember his remarkable powers of pen, tongue the witchery of his conversation, catholicity of his outlook and the inborn love of humanity.

The terrible loss would have been unbearable, had he not left behind him his worthy son Maulana Saeed,* a great scholar, a true replica of his father and a perfect image of nobility and virtue. He closely followed his father in his wake and drank deep from the fountain of knowledge. He is unique in letters and religious sciences, and now we fix our gaze on the beacons that shine on the horizon of his future. His remarkable powers of pen and tongue, rare journalistic gifts, phenomenal virtue of oration and laudable qualities of head and heart—all these have combined to make him an attractive figure in the world of intelligentia.

I extend my sympathy and condolence to the worthy sons of the diseased in their sad bereavement and pray that the Almighty may grant them fortitude in order to cope with the brunt of the grief.

May his soul rest in peace!

A War Lyric of Thomas Hardy

BY

Ahsan

Perhaps few war poems excel the following little song of Thomas Hardy written at the beginning of the last Great War, September 5, 1914:—

What of the faith and fire within us
    Men who march away,
    Ere the barn-cocks say,
    Night is growing grey,
Leaving all that here can win us;
What of the faith and fire within us,
Men who march away!

Is it a purblind prank, O think you,
    Friend with the musing eye,
    Who watch us slipping by
    With doubts and dolorous sigh?
Can much pondering so hoodwink you?
It is a purblind prank, O think you
Friend with the musing eye.

labyrinth of doubts and heresy and made a long stride forward towards the spiritual development. He explored all the avenues to pull down the prison walls of humanity and pass on to a province beyond, called Divinity. He was a man of magnificent and immortal lustre and his sermons sprang from the recess of immortal windows. People of different shades of opinion would rally round the banner of his piety and truth and on account of his laudable activities his trampling footsteps will echo down the corridor of time and his bright annals will prance merrily down ages. His harangues were full of ripe wisdom and noble reflections on life which remind us of the saints and the sages of the past who march in glorious procession through the ages and make the world a dream of music for the inward ear and of delight for the contemplative eyes.

The habitual effacement of his own personality marked a delicate and rare shade in his character for the sacred purity of truth. He used to march through the intricacies of things in a blaze of certainty, and on account of his precious qualities of head and heart, he made a quick way into the Temple of Fame. He was the custodian of all good qualities which are found in an ideal man, an ideal scholar, an ideal preacher, and an ideal orator. Urbanity of his manners generosity of disposition and kindliness of heart constituted the core and kernal of his nature. We cherish a loving memory of him and have a warm corner for him in our heart.

He used to cast lustre on his social horizon and was deemed as an ideal host. Those who had the pleasure of his hospitality know the naturalness and warmth of his welcome and the complete absence of any show, formality and pomp. His serene temperament and the magic of conversation arrested the attention of people and made them spell-bound. He was so courteous that he considered it a sin against humanity to wound the susceptibilities of the humblest of humble and the lowliest of the lowly.

His occasional touches of humour would brighten the social atmosphere and impose a premium on pleasure. In the midst of rough and tumble of life, he had a rich fund of cheerfulness and humour and snapped his fingers at the fret and fever of existence.

Our Manjana was a rarity among scholars and his extensive studies gave a fresh zest to his discourses and harangues and charmed the audience to an amazing degree. His sanity of outlook was laudable, and his sterling ability was admirable and he loomed large in the world of letters, Islamic history, philosophy and religious sciences. He was born with a pen in his hand and he very successfully shouldered the onerous task of writing about a hundred books on various subjects. Masculine vigour, soundness of reasoning and a marvellous

is dead and a pure light is gone for good. His religious fervour, his devotion to muses, his intense love of learning, his burning patriotism, and his heroic struggle against adverse circumstances, made him occupy a unique position in public life. His piety stood in bold relief specially during these days when materialism reigns supreme and the voice of virtue has been dwindled in the booming of guns, in rattling of aeroplanes in greed of gold and power and in the whole-sale massacre of humanity. Nation against nation is the order of the day, individual against individual is a current coin, indulgence against the high ideals of humanity is the be-all and end-all of life.

Our Maulana ranks with the immortals as he lives in his works, in his poems and addresses, in his help to orphans and widows, in his piety and virtue, in his altruism and fellow-feeling, and in his courtesy and firmness. He was in living touch with streams of spiritual life and brought within our vision the high ideals of humanity and noble sentiments of morality and guided the people through the intricacies of doubts and heresy

He was inspired by high ideals of humanity leading his followers to the sacred path of virtue and divinity. He combined in him a philosopher of great renown a matchless literary man, the greatest Indian poet in Arabic and one of the greatest Mujtahids in our motherland. His whole life was nothing but a sacred spiritual pilgrimage calling a halt upon surging passions of humanity, and enjoying the wholesome communion of Divinity.

His virgin thoughts arrested the wholesale attention of the wise and his pregnant remarks would make the listeners spellbound. He was an apostle of universality, he was true replier of the sages of the hoary past and he was a friend even to his faces. Innocence was the core and kernal of his life and sympathy to the poor was the be-all and end-all of his existence. He was in living touch with the true ideals of morality and his religious discourses and pious sermons would produce the wholesome effect of reformation and would bring about tears from the eyes of listeners. He was the renowned author of *Abqat*, a religious history written in a number of volumes, which is sure to immortalise him and make him march through history with a voice like a clarion trumpet.

Resplendent blaze of his rhetoric would kindle a glowing reflection of magnanimous passions in the ears of his audience. His grace of manners, his scholarship, his catholicity of outlook his genial disposition, his piety and virtue, all these virtues, combined to make him a unique personality and the essence of humanity. He revealed truth to mankind and kindled a glowing reflection, when the spiritual fabric of society was tottering on its very foundation and a gloomy future was in store for it. He guided us through the bewildering

resources of Germany is proceeding at a very quick pace. We will not be surprised if tomorrow Hitler comes down like a pinched balloon. In the last War the Allies had lost many a battle but won the War. So will it happen this time too. History will repeat itself.

• • •

ADIEU 1942.

This is November. After a month again comes the month of god Janus and it will be 1943. Time passes. Hitler is busy on the Russian front. Col. Winter is advancing. A sad news for the German High Command. We are dreaming of very good time in December. Our College activities are inversely proportional to those of Hitler.

—Ali Raza

ISLAMIC TRAGEDY

BY

Professor Syed Sadiq Husain
Head of the Department of Arabic,

[Who can appreciate the scholarship of our late Maulana Nasirul Millat better than a Professor of Arabic, and our Professor Husain was also in personal contact with the late Maulana. We publish this article as one written by the author on the editor's special request and in the characteristic style of which he is a past master and which has gained the praise of such men as Professor Sidhanta himself—***Editor.***]

Colossal tragedy looms large on the Islamic horizon, as the cruel hands of death have snatched from among us the prominent figure of Maulana Nasir Husain Saheb, the embodiment of culture and the dynamic personality in the realm of letters. The tragedy is too deep for tears, too intense for words and causes our flesh creep with grief. It is a terrible shock to the whole Shia community and it is nothing short of a bolt from the blue, swift, sudden and stunning in its effect. His demise has set ablaze the smouldering embers of sorrow.

One of the finest souls that was ever encased in human flesh has shuffled off the mortal coil and gone to its place of eternal peace and happiness. Alas he died amidst the tears of the ardent lovers of piety, died amidst the blaze of spiritual glory, died amidst the full moon of divine wisdom, died amidst popularity and renown and died amidst groans redoubling upon groans and sighs upon sighs.

As my heart is full my lips falter, and all that I can say is that our Maulana

Election—'the Ballot Box' as they call it. The polling under the office of Mr. Ashiq Husan, the president and Mr. Sarfraz Husan, was conducted with all propriety. The following was the result brought out to impatient students giving expression to their anxiety by means of howls and shouts:—

1. Agha Shafaat Qasim Qazilbash, Vice President.
2. Ahmad Agha Rizvi, Secretary.
3. Zulfiqar Husain, Joint Secretary

Besides our activities extended to inviting quite a number of worthy guests. We were highly entertained by the speeches of Mr Usman Woo of Chinese Muslim Federation, but perhaps more on the same occasion by the speech of Alama Ibn-i-Hasan Jarchavi. We had another visitor in S. Liqa Ali Sahib whose address to students on education was extremely psychological. A third visitor was Maulana Nizami Sufi whose expoundation of the universal tenets of Islamic faith gave us a deep pleasure

• • •

SCIENCE ACTIVITIES.

We have organised three societies, to promote healthy interest in science, namely General Science, Chemistry and Physics societies. They have been holding debates, lectures and excursions.

• • •

THE WORLD ABOUT

The world is in a melting pot. A war is going on. The war has been given many names. But for aught we know, it is a back-bending war. For us Indians, it has been *back-bending* and nothing more. It is bending the backs of poor people groaning under the heavy weight of raised prices. There is no doubt about this, but it is also bending the backs of some of the rich people. You will find that the backs that were always stretched over velvet cushions of motor-car seats, are now seen bending over bicycle handles, as their owners carry on the now tedious task of visiting friends.

The War, however, goes on. Hitler, as his last speech shows, probably thinks that all battles won by him were but so many nails driven into his own-coffin. Mr. Churchill, on the other hand, goes on saying confidently "the central direction of the war has not failed." The issues are in dark, the true facts are unknown to us. But one thing is certain the exhausion of the military and the economic

Any way, is it not a privilege? That it has been all quiet in Shia College, when the University has been closed *sine die*, when almost every school and college in U. P., was shaken by the blast of the so-called National crisis! It is certainly a credit to us students who are sensible enough to realise that to break the hedge-rows, to destroy the cattle, and to put the hay-stack a-fire, is not the way to gain freedom.

Really we do not see any sense in students going on a 'strike.' We do not know what absurd person first made students do so. In fact students who go on "strike" degrade themselves for they put themselves in the place of poor, mean and vulgar labourers in a factory, going on strike when beaten by their blood-sucking, tyrannical employer Pity for the students who consider themselves so related to their teachers !

* * *

RELIGIOUS INSTRUCTION

Ours is a denominational institution. But unlike other such institutions we do not insist on non-Shia students to take part in any religious activity Our principal is deeply rooted in religion. Besides the theology classes and lessons that have been coming from time immemorial, he has introduced ways to make students concentrate on the practical side of religion. All holidays on the birth and death anniversaries of Imams, have been abolished and instead we have lectures on the lives of the Imams; every Friday is a half-day and we are required to march to the Masjid-i-Asafi to say our prayers after College hours; arrangements have also been made for *zoharain* prayers in the College hall and the time of the second interval has been extended to half an hour. We are feeling religion to be a reality.

* * *

NASIRUL MILLAT.

The death of Maulana Nasir Husain Sahib Qibla was the saddest event of the quarter under review. He has left a gap that will not be easily filled up—in the realm not only of Shia theology, or Muslim theology, but also in the wider realm of learning and scholarship and letters. With our College he had connections of the most intimate sort—he was one of the founders of our college. We pay whatever tribute we can to his memory. His name will ever remain a star to guide us.

* * *

LITERARY ASSOCIATION.

Our literary association had its first activity, and quite a thrilling one, in the

EDITORIAL NOTES

NOTHING TO SAY.

Really, we have nothing at all to say! What we have done is very small compared to what we expected to do. It is better if we keep silent.

For one thing, keeping in view the ideal aim of a College Magazine, that is to give the students a taste for journalism and authorship, we have taken pains to make the students themselves write articles on suitable subjects suggested by us. No doubt this meant a tremendous amount of correction and editorial work for us, but keeping in mind the immense amount of good that this would wrought, we had made it a point to see this work through.

We pay it as a tribute to our last Editor-in-chief who by his wise management of our finances, has left a rich backing for us. Our funds have also been separated from under the tutelage of Literary Association.

• • •

HINDI SECTION

It was also proposed to start a Hindi section of our magazine this year. A sub-editor for Hindi articles was appointed and quite a number of articles were received. But they are lying in the editors shelf. We do not have a teacher to supervise the work, all our teachers being Urdu knowing. Besides, it is better for us, as some institutions, even in Lucknow, prefer, to keep away from the annoyin Hindi-Urdu controversy and to follow our traditions

• • •

OUR PRINCIPAL AND OUR COLLEGE.

Our Principal is just the sort of man we wanted for our College—a man of learning, of character, and of tact. The most distinguishing mark of his attitude towards us is sincerity. He knows how to make mercy season justice. In spite of enormous handicaps, drawbacks at every step, he is leading us up the way, a soldier in a religious cause. He attends most carefully even to the minutest details of the college business.



ON THE DEATH OF OUR NASIR-UL-MILLAT.

The Soul of Muslim world is fled O weep!
A monarch of the Universe of Thought,
A perfect man, master of learning deep,
Disturbed by cares in whom refuge we sought!

The honey'd words, the personal touch sublime,
The marvel of a memory and the Art,
The noble Art of Virtue as its prime
Alas, these heavenly gifts with him depart!

Why weep! He is not dead Such peerless men
Do never die: their souls as beacon-light,
Shine ever here and ever brightest when
Beset we are in dark and black midnight

So long as light of Love and Truth there be
So long we live and in our hearts lives he.

—*'Ahsan'*

List of Contents

NOVEMBER, 1942. VOL. XVI. No. 2.

THE "ARCH WAY"

The Shia Inter College Quarterly



OUR COLLEGE ENSIGN

Prepared by :—

Prof. M. N. ZUTSHI.

Printed by Manager S. Riaz-ul-Hasan at the Nizami Press, Lucknow and published by the Editor, Md. Ahsan M.A.
Shia Inter College, Lucknow.

Editorial Board


THE CITY OF KNOWLEDGE AND
The ARCH